دُرِ یگانہ

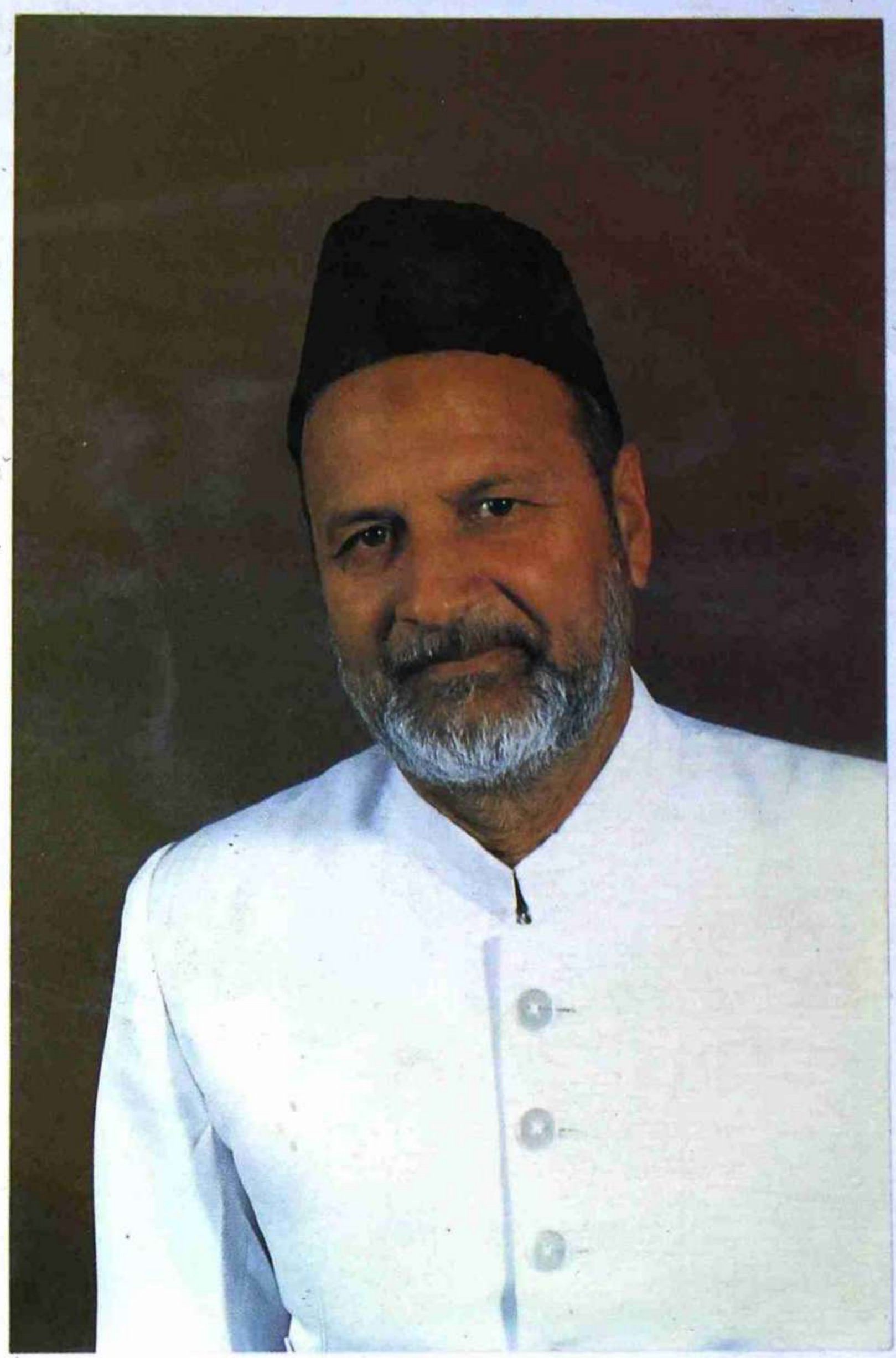

زعیم ملت پروفیسر مولانا سید عنایت حسین جلالوی

نام کتاب دریگانہ
تاریخ اشاعت ۱۵، شعبان المعظم بمطابق ۱۶، جنوری ۱۹۹۵ء
تعداد ۱۰۰۰
مقام اشاعت A - 59 ابوالحسن اصفہانی روڈ کراچی
خط وکتابت A - 418 لیسین آباد فیڈربی بی ایریا نمبر ۹ کراچی

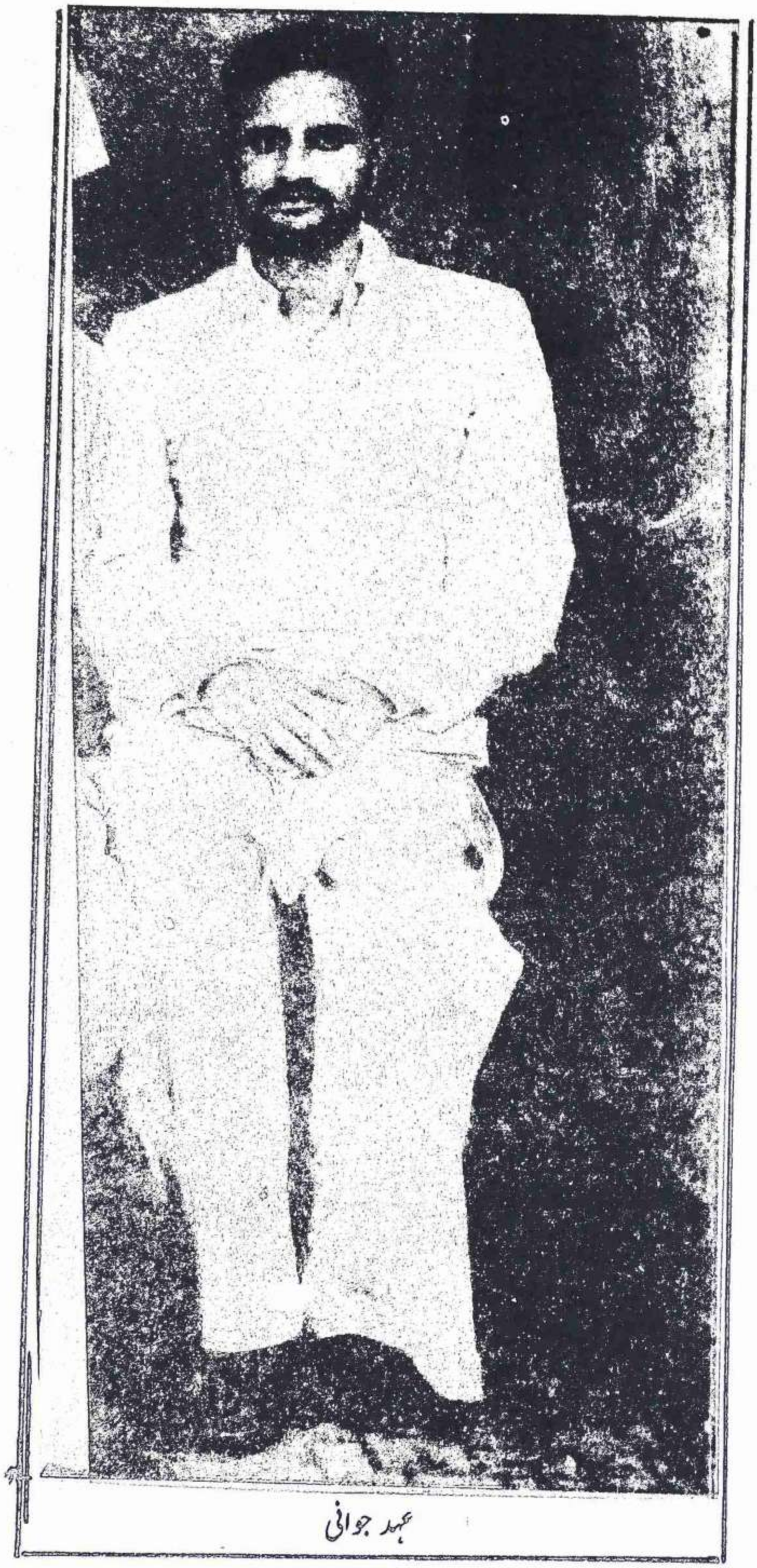

عہد جوانی

منبر پہ قدم ، سر پہ علم ، حضرتؑ کا
اب چاہیئے کیا ؟ تخت ملا تاج ملا

کون رخصت ہوا؟

○ سابق جنرل سیکریٹری ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ ،

○ سابق نائب صدر شیعہ مطالبات کمیٹی ،

○ رفیق خاص دست راست قائدین ملت جعفریہ مولانا سید محمد دہلوی و مفتی جعفر حسین اعلیٰ اللہ مقامھما ،

○ موسس مسجد وامام بارگاہ عابدیہ بی ون ایریا لیاقت آباد ،

○ میجنگ ٹرسٹی بوتراب جامع مسجد وامام بارگاہ ٹرسٹ ،

○ بانی مجلس ملی پاکستان ،

○ مہتمم و منتظم جامعہ امامیہ کراچی ،

○ سرپرست مسجد وعزاخانہ ابو طالب موسیٰ کالونی ،

○ علم ودانش کا حقیقی متلاشی جس نے ۱۴ برس کے لگ بھگ برصغیر کی عظیم درسگاہ " مدرسہ ناظمیہ " میرٹھ کی درسگاہ " منصبیہ " اور بنارس کے مدرسہ " جوادیہ " میں قابل ترین اساتذہ وعلماء سے کسب فیض کیا۔

○ جس نے زمانہ طالب علمی میں اپنے ہم عصر طلبا مفتی آغا طیب الجزائری (ایران) مولانا سید عابد مرحوم ، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل مرحوم اور دیگر کے ساتھ تعلیمی اقدار کے فروغ اور طلباء کی تحریری و تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے " کُل ہند ایجوکیشن کانفرنس " کی بنیاد رکھی اور " العِلم " نامی جریدے کا اجراء کیا۔

○ قوم وملت کے حقیقی غمخوار جس نے قوم کو ذہنی عیاشیوں سے نکال کر اس کے لیے علم و عمل کی روشن راہیں متعین کیں جس کے پاس قوم وملت کے درد و غم کا درماں موجود تھا۔

○ وہ بے لوث پیکر اخلاص ومروت جس نے ہمیشہ اپنے ذاتی اور خاندانی مفادات کو قوم کے وسیع تر مفادات پر قربان کیا۔

○ وہ حسینیؑ فداکار، حبیب ابن مظاہرؑ کا سچا پیروکار، بوڑھا مجاہد جو بارہا نازک ترین موقعوں پر اپنی پیری اور ضعف کی پرواہ کیے بغیر جان جوکھوں میں ڈال کر عزم واستقامت کا پیکر بنے ڈٹا رہا۔

○ عشق حسینیؑ کے جذبے سے سرشار، جس کی زندگی کا ہر ہر لمحہ عزائے حسینؑ کے لئے وقف تھا جس نے ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں مجالس میں بے مثل ذاکری کی سعادت حاصل کی لیکن کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا۔

پیامِ تشکر

سید عنایت حسین جلالوی اعلیٰ اللہ مقامہ کا انتقال ہمارے لئے ایک سانحۂ عظیم ہے۔ باپ کا سایہ اولاد کیلئے خدا کی طرف سے کتنی دنیاوی آفات کیلئے ایک مضبوط پناہ گاہ ہوتا ہے اس کا اندازہ ہمیں یتیمی کی دھوپ میں ہوا۔ گو اس حقیقت کی معرفت ہمیں بھی ہے کہ زندہ وجود اپنے منطقی انجام کو برضائے الہیٰ ضرور پہنچے گا۔ مگر بعض صدمے اتنے جانکاہ ہوتے ہیں کہ دلائل اور حقائق اس کی شدت کو کم نہیں کر سکتے۔

خدا کی رحمتیں ہوں ان لوگوں پر جو ایسے عظیم صدموں میں مبتلا سوگواران کو صبر کی ہمت دلاتے ہیں ۔ والد گرامی کے انتقال پر اہل دل احباب نے جس طرح ہماری دلجوئی کی اور ہمارے والد کے سوگ میں اپنی شرکت کا احساس دلایا وہ خدا کے بعد ہمارا سب سے بڑا سہارا بنی ۔

میں اپنی اور اپنے اہل خانہ کی طرف سے ایسے تمام افراد کا متشکر ہوں جنہوں نے والد کے انتقال سے لیکر اب تک تمام مراحل میں ہمارا ساتھ دیا مجلس تعزیت میں شرکت کی صورت میں ، مجالس کا اہتمام کرنے کی صورت میں ، اور ذاتی حیثیت میں ہمارے غم میں شرکت کرنے کے حوالے سے کہ انہوں نے ہمارے غم کو اپنا غم سمجھا۔

یہ یادگاری کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے اس کی ترتیب وتدوین اور اشاعت کے سلسلے میں جن جن حضرات نے جو کاوشیں کی ہیں اور در حقیقت جن کی رہنمائی اور مدد کے بغیر ہم اپنی اس حقیر کوشش کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکتے ہم ان حضرات کے شکر گزار ہیں خصوصاً محمود الحسن رضوی صاحب اور پروفیسر سبط جعفر صاحب جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوصف اس کتاب کو اس شکل میں آپ کے ہاتھوں تک پہنچانے کیلئے ہر قدم پر ہماری رہنمائی فرمائی۔

یہ قدرت کی طرف سے اس کے بندوں کیلئے نعمت ہے کہ گزرتا وقت ہر صدمے کی شدت کو پہلے سے کم کردیتا ہے لیکن اس صدمے میں متاثرین کا کس نے کتنا اور کس طرح ساتھ دیا اسکے نقوش بہت پائیدار ہوتے ہیں۔جو وقت کی دھند میں مدھم نہیں پڑتے۔

تمام اعزاء واحباب کی محبتوں کا

ممنون

سید مصدق حسین

"فکرِ جلالوی"

ملت جعفریہ کے عزووقار کیلئے
چند اہم تجاویز

۱۔ خوفِ الہیٰ اور نمازِ پنجگانہ کی پابندی ہی ایمان کی علامت ہے۔

۲۔ اسلامی اقدار کا تحفظ اور ذاتی کردار کی تعمیر محبتِ اہلبیتؑ کی بہترین دلیل ہے۔

۳۔ مساجد اور امام بارگاہوں کی مرجعیت اور مرکزیت ہی ہماری فلاح کا باعث ہے۔

۴۔ مجالسِ سید الشہداؑ میں فضائل ومصائب کے ساتھ اوامرونواہی کی تبلیغ اور نکتہ چینی کے بجائے ملی امور کو سلجھانا وقت کا اہم تقاضہ ہے۔

۵۔ ملی تعمیر کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ رشوت، بددیانتی، اسمگلنگ اور ملاوٹ جیسی بداخلاقیوں سے دور رہا جائے چاہے ہم دنیاوی دوڑ میں پیچھے ہی کیوں نہ رہ جائیں۔

۶۔ دنیاوی ترقی کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ ہم جس شعبۂ حیات میں بھی ہیں زیادہ سے زیادہ محنت اور کوشش کرکے کمال حاصل کریں کیونکہ یہی ہمارا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

۷ ۔ ملت جعفریہ کے نوجوانوں کو وقت کا چیلنج قبول کرنا ہی پڑے گا کہ اس دور میں وہی کامیاب ہے جو علم وہنر میں بے مثال ہے۔

۸ ۔ اقوام کے روشن مستقبل کا انحصار نوجوانوں کی بہترین تربیت اور اعلیٰ نظم وضبط میں مضمر رہتا ہے۔

۹ ۔ دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی طرف بھی توجہ کیجئے تاکہ آپ کی مذہبی برتری قائم ودائم رہ سکے۔

۱۰ ۔ ذرائع ابلاغ عامہ کا حصول اور تالیف وتصنیف ہی آپ کو اپنوں اور غیروں میں سرخرو بناسکتے ہیں۔

۱۱ ۔ آپ کی لائبریریاں فریاد کر رہی ہیں کہ ہمارا کوئی پوچھنے والا نہیں خدارا ان کی جانب توجہ کیجئے۔

۱۲ ۔ خمس وزکوٰۃ کے نظام کی ترویج ہی ہماری مشکلات کا حل ہے اور دینی ودنیوی ترقی کا ضامن بھی۔

۱۳ ۔ کیا آپ کسی اقتصادی اسکیم سے منسلک ہیں ؟ نہیں تو کچھ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے ضرور سوچئے۔

۱۴ ۔ مسلمانوں میں اتحاد اتفاق کی بھرپور کوشش کیجئے کیونکہ مملکت کا استحکام اسی پر منحصر ہے۔

ہمارا خاندان

سید بادشاہ حسین شوق جلالوی

ہمارا وطن مالوف جلالی

" جلالی " ضلع علیگڑھ کے ایک ایسے قصبے کا نام ہے جسے آل شاہ ہمدانؒ نے آباد کیا۔ بستی کا پرانا نام " نیلاوتی " تھا۔ قدیم تواریخ میں اس کا ذکر واضح الفاظ میں ملتا ہے ، ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں جلالی کا تذکرہ کیا ہے علاوہ ازیں سلطان سکندر لودھی کی رسم تاجپوشی بھی اسی بستی کے نواح میں انجام پائی۔ مرکزی شاہراہ پر ہونے کے سبب سے بادشاہ اور امرا کے لئے اہمیت کی حامل رہی ۔چنانچہ غیاث الدین بلبن نے جلالی میں ۶۶۵ ھجری میں شاہی شیعہ جامع مسجد تعمیر کرائی جو فن تعمیر کے حوالے سے عہد مغلیہ کی عظیم الشان یادگار ہے۔ اسکے علاوہ متعدد مساجد وامام بارگاہ ہیں جو نادر ونایاب نمونوں پر انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب بنی ہوئی ہیں جن کی وجہ سے آج بھی یہ عظیم وقدیم بستی سادات جلالی کی شان وشکوہ اور رعب ودبدبہ کی آئینہ دار ہے۔

مہمان نوازی

جلالی کے سادات جن امور میں دوسروں سے ممتاز وممیز ہیں ان میں ایک اہم خوبی ان کی مہمان نوازی ہے ۔ خصوصاً ذاکرین حسینؑ ، علماء کرام وخطباء عظام کی جو پذیرائی ، عزت وتکریم اور ان کی آمد کے موقع پر جو انتظام

وانصرام جلالی کے سادات کیا کرتے تھے اس کے لئے یہ سب علماء وخطبا اپنی زندگی میں رطب اللسان رہے۔ اسی حوالے سے خطیب اعظم قائد ملت جعفریہ پاکستان مولانا سید محمد دہلوی کا ایک دلچسپ جملہ یاد آرہا ہے جو مرحوم جلالی کی مہمان نوازی اور علماء وخطباء سے اہل جلالی کی عقیدت واحترام کے حوالے سے ازراہ تفنن کہا کرتے تھے کہ " بھئی ہم تو جنت میں جلالی کے ہوٹل میں قیام کریں گے کہ وہ جنت کی بھی جنت ہوگی ۔"

سادات جلالی مذہبی وملی اہمیت کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہے ہیں مساجد وامام بارگاہوں کا انتظام واہتمام انکا شغل رہا ہے اور یہ جذبات وخدمات صرف اپنی بستی تک محدود نہیں رہیں بلکہ جب ناصر الملت اعلیٰ اللہ مقامہ اپنے رفقاء کے ساتھ شیعہ عربک کالج کے لئے فنڈز جمع کرنے کی تحریک پر جلالی پہنچے تھے تو جلالی کے سادات نے ۳۹ ہزار روپے کی خطیر رقم اس عظیم مذہبی اور ملی خدمت کی انجام دہی کے لئے مولانا مرحوم کی نذر کی تھی علاوہ ازیں لکھنو کے دینی مدارس اور مزار اقدس شہید ثالثؒ کے لئے بھی دامے ، درمے مختلف حوالوں سے خدمات انجام دیں۔

جلالی کی عزاداری

درحقیقت جلالی کی شہرت کا ایک اہم سبب وہاں کے مومنین کا عزائے حسینؑ سے والہانہ لگاؤ ہے۔ عزاداری ہمیشہ سے اہل جلالی کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری ملت جعفریہ کے ہر فرد کی زندگی میں عزاداری اور مجلس عزاء کی کیا اہمیت وحیثیت ہے ، اگر ہمارے مکتب ومذہب سے واقعہ کربلا اور اس کی یاد منانے کے تاریخی وقدیمی سلسلے کو نکال دیا جائے تو پھر ہم میں اور دوسروں میں کوئی فرق نہ رہے ۔ یہ عزاداری ہی وہ

شعار اور شیوہ ہے جو ہمیں دوسروں سے ممتاز اور ممیز کرتا ہے اور یہی وہ امتیاز ہے جو اس حدیث رسولؐ کے عین مطابق ہے کہ " عنقریب میری امت میں ۷۳ فرقے ہوں گے سب ناری لیکن صرف ایک ناجی " ۔

جلالی کے سادات ومومنین عزاداری کو اپنا مقصد تخلیق اور نصب العین سمجھتے رہے ہیں اور سمجھتے ہیں ۔ عشق حسینی کے جذبے سے سرشاری کا یہ عالم کہ ابھی محرم کا چاند طلوع نہیں ہوا کہ سارے چھوٹے بڑے امام بارگاہوں اور درگاہوں میں مرمت اور سفیدی وغیرہ کا کام مکمل کرلیا گیا ، چاند رات کو فرش ، چاندیاں ، جھاڑ ، فانوس کتبے اور پردوں وغیرہ سے عزاخانے آراستہ کردیئے گئے ، چاند ہوتے ہی ہر عزاخانہ میں تبرکات اور علم سجادیئے گئے اب بارہ روز تک سادات ومومنین کو مسلسل رات دن کوئی کام نہیں صرف اور صرف مجلس حسینؑ میں شرکت کرنے کے علاوہ کوئی مصروفیت نہیں ، کوئی دنیاوی جھمیلہ نہیں ، طلوع آفتاب سے مجالس شروع ہوتی ہیں اور رات گئے تک جاری رہتی ہیں اور مومنین ومومنات آرام وطعام کی پرواہ کئے مجالس میں شرکت کرتے ہیں۔

جلالی میں منعقد ہونے والی مجالس مومنین کے گریہ وبکا اور رقت کے حوالے سے بیحد معروف ہیں۔ ایک خاص بات یہاں کی مجالس کی یہ ہے جو کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی وہ یہ کہ اگر مجلس کا آغاز ہوا ہے اور گریہ اپنے شباب پر ہے تو پھر مجلس وہیں تمام کردی جائے گی ۔ اس سبب سے کہیں سوزخوانی پر اتنا گریہ ہوتا ہے کہ مجلس ختم کردی جاتی ہے اور کبھی مرثیہ پر رقت وبکا کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ذاکری کی گنجائش نہیں رہتی ۔

جلالی کی عزاداری میں ہمارے چھوٹے دادا رئیس جلالی مرحوم حاجی سید محمد حسین جلالوی کا بڑا نمایاں کردار ہے ، موصوف عزائے حسینؑ کے حقیقی شیدائی اور نام مولیٰ اور عزائے مولیٰ کے لئے پیسہ پانی کی طرح بہاتے

تھے۔ آپ کی جانب سے امام بارگاہ " نصیر " میں مجالس عزاء بڑے اہتمام وانصرام کے ساتھ منعقد ہوتی تھیں۔ (یہی امام بارگاہ ہمارا خاندانی امام بارگاہ ہے۔) انکا ایک خاص وظیفہ وطریقہ تھا جو بڑا منفرد بھی تھا اور معرفت حسینی میں ڈوبا ہوا بھی وہ یہ کہ جب مرحوم عید الاضحی کے روز قربانی کرتے اور جونہی جانور کے گلے پر چھری پھیرتے ، اپنے ملازم کو آواز دے کر کہتے کہ " عزاخانہ کھولدو بس آج ہی سے محرم ہے " گویا اپنے اس عمل سے حضرت اسمعیل اور حضرت امام حسینؑ کی قربانی کے واقعات کے ربط وتعلق کو واضح کرتے اور سنت ابراہیمی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ذبح عظیم کی یاد کا بھی اہتمام کرتے۔

ہندوستان کے مایہ ناز خطباءؑ واعظین مثلاً برکات احمد صاحب مرحوم ، علامہ حافظ کفایت حسین صاحب مرحوم ، خطیب اعظم مولانا سید محمد دہلوی مرحوم ، ملک الناطقین مولانا سید ابن حسن قبلہ نونہروی وغیرہ سمیت شاید ہی کوئی ایسا خطیب اور واعظ ہو جو جلالی مجلس پڑھنے نہ آیا ہو بلکہ متذکرہ بالا ذاکرین وواعظین تو جلالی کی عزاداری کے اس قدر مداح ودلدادہ تھے کہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جو ذاکر مصائب میں جلالی میں کامیاب نہیں ہے وہ دنیا کے کسی گوشے میں کامیاب نہیں ہوسکتا ۔ ان عظیم خطباء وعلماء کا یہ قول جلالی کی نورانی ومقبول مجلسوں کو سمجھنے میں مددگار ہوسکتا ہے۔

سید حامد حسین

ہمارے دادا سید حامد حسین مرحوم ، سید احمد حسین یعنی ہمارے پردادا کے بڑے صاحبزادے تھے۔ انتہائی متاثر کن اور بارعب شخصیت کے وجیہہ وشکیل مرد تھے ۔ عموماً ڈپٹی صاحب کہلاتے کیونکہ ہمارے پردادا سید

احمد حسین بذات خود ڈپٹی کلکٹر تھے لہذا یہ ایک طرح سے خاندانی لقب بن گیا تھا اسی حوالے سے ہمارے دادا سید حامد حسین اور پھر ہمارے والد سید انعام حسین مرحوم " ڈپٹی صاحب " کے لقب سے موسوم رہے۔

بی بی عنایت فاطمہ بنت عطا محمد

ہماری دادی عنایت فاطمہ انتہائی متین ، سنجیدہ ، بردبار اور حالات سے نبردآزما رہنے والی اور شدائد ومصائب میں بھی ہمت نہ ہارنے والی خاتون تھیں جب ان کی شادی ہمارے دادا سید احمد حسین سے ہوئی تو یہ یقیناً ہمارے خاندان کی عظمت و جلالت کا سنہری دور تھا۔ عزت و حشمت ، دولت و سطوت سب کچھ ہی تھا کیونکہ ہمارے پردادا ڈپٹی کلکٹر ہونے کے سبب سے اتنا کچھ چھوڑ گئے تھے جو متمول افراد کی شان وشکوہ کیلئے بہت کافی ہوتا ہے ، کئی سو ایکڑ زمین تھی ، اس زمانے میں نوٹ نہ ہوتے تھے بلکہ چاندی کے سکے رائج تھے جن کے ڈھیر لگے رہتے اور جب ان پر میل آجاتا تو سال میں ایک دفعہ اہتمام کے ساتھ ان کی صفائی ستھرائی کا کام انجام دیاجاتا ایک یہ دور تھا پھر نیرنگئ زمانہ نے وہ وقت بھی دکھایا جب ان کے بیٹے یعنی ہمارے والد سید انعام حسین کا انتقال ہوا اب وقت بدل چکا تھا گو کہ وہ شان وشوکت اور جاہ وجلال تو نہ رہا تھالیکن ہماری دادی کو خاندان کی عظمت کا بڑا خیال تھا انہوں نے بڑے صبروضبط ، متانت و سنجیدگی سے وقت گذارا اور ہماری کفالت میں بے حد دلچسپی لی۔

ہمارے والد کے انتقال کے بعد وہ ۷ یا ۸ برس زندہ رہیں ہم لوگوں کی پرورش اور تربیت میں انہوں نے بہت زیادہ تکالیف برداشت کیں۔ ہماری بڑی بہن ریحان فاطمہ کی شادی کا سلسلہ بھی ان کی زندگی ہی میں طے

پایا اور بڑی شکوہ کے ساتھ ہمشیرہ کو گھر سے رخصت کیا گیا۔ مرحومہ نے اپنی زندگی میں بڑے صدمے دیکھے، چار حقیقی بھائی سید علی محمد، جعفر محمد، امیر محمد اور بشیر محمد ایک بڑی بہن عزرائے فاطمہ، ایک بھانجی حبیب خاتون اور آخر میں اکلوتے بیٹے سید انعام حسین (ہمارے والد) کے داغ ایسے تھے جنہوں نے ان کے کلیجہ کو چھلنی کر دیا تھا۔ ماں باپ کا غم تو سب ہی کو ہوتا ہے پھر جائداد کی بربادی، حالات کی ناسازگاری کچھ ایسے مراحل تھے جو کسی بھی عالی حوصلہ شخص کے ارادوں اور عزائم کو ناکام بنادیں لیکن مرحومہ صبر کرتیں، ہروقت امام مظلومؑ کے صبر اور مشکل کو یاد کرتیں، صوم وصلواۃ اور عزاداری ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ۲۴ شوال ۱۹۴۳ء کو جب ان کا انتقال ہوا تو مولانا مرحوم ان کے سرہانے موجود تھے ہمارے بڑے بھائی شملہ میں تھے ان کا آنا دشوار تھا لہذا ساری خدمات مولانا مرحوم نے ہی انجام دیں۔

سید انعام حسین

ہمارے والد سید انعام حسین مرحوم ہمارے دادا سید حامد حسین کے اکلوتے بیٹے تھے گو کہ جائداد وغیرہ کچھ زیادہ نہ تھی لیکن اس کے باوجود بیحد سخی اور دریا دل انسان تھے اور ائمہ کی پیروی کرتے ہوئے کسی سائل اور کسی مہمان کو بلا تواضع نہ جانے دیتے۔ دوستوں اور عزیز واقارب سے حسن سلوک اور خدمت ومدد کے جذبے نے اس دور کے بہت سے لوگوں اور روساء سے آپ کو ممتاز کر دیا تھا انتہائی خوش وضع اور خوش پوش تھے اپنے والد کی خوبصورتی اور وجاہت کے وارث تھے جب منبر پر تحت اللفظ پڑھنے بیٹھتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے شیر گرج رہا ہے۔ جلالی کے تحت اللفظ خوانوں میں ایک درسگاہ کا درجہ رکھتے تھے اور بذات خود میر انیسؒ کے پوتے دولہا صاحب مرحوم کے شاگرد تھے جن کے لئے کہا جاتا ہے کہ ان سے بہتر

مرثیہ پڑھنے والا نہ ہوسکا جو " اوج " تخلص کرتے تھے۔ عیسوی حساب سے ہمارے والد کی تاریخ وفات ۶ جنوری ۱۹۳۶ء ہے انتقال سے قبل ڈیڑھ برس بیمار رہے مرض استسقا میں مبتلا تھے، ہر طرح کا علاج کرایا لیکن فائدہ نہ ہوا بقول شاعر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

والد کے انتقال کے وقت ہم تینوں بھائی یعنی سید احمد حسین حیدری مرحوم، مولانا عنایت حسین جلالوی مرحوم اور راقم الحروف چھوٹے تھے۔ جب کہ ہماری بڑ بہن کی عمر تقریباً ۱۴ یا ۱۵ برس ہوگی ۔ حقیقت یہ ہے کہ والد مرحوم سید انعام حسین کے انتقال سے ہمارے خاندان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ یہ ایسا سانحہ تھا جس کے بعد ہم لوگ صحیح طور پر سنبھل نہ سکے خاندان میں کوئی بزرگ نہ رہا تھا اس لیے خاندانی عظمت تقریباً ختم ہو گئی ۔

ریحان فاطمہ

میری بہن ریحان فاطمہ سید انعام حسین کی سب سے بڑی اولاد تھیں ہمارے والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۱۴ یا ۱۵ برس کی ہوگی ۔ والد کے انتقال کے بعد ہماری دادی مرحومہ نے اپنی زندگی میں ہماری بہن کی شادی کی اور وہ رخصت ہو کر کانپور کے ایک انتہائی مذہبی اور دیندار گھرانے میں گئیں ہمارے بہنوئی ظفر مہدی صاحب کانپور کی فعال مذہبی شخصیت ہیں افسوس کہ گذشتہ برس شعبان کے مہینے میں ہماری بہن نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحومہ کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں جو کانپور میں مقیم ہیں البتہ بڑی صاحبزادی کراچی میں رہائش پذیر ہیں ۔

سید احمد حسین حیدری

ہمارے بڑے بھائی سید احمد حسین ہمارے والد کے انتقال کے وقت علی گڑھ مسلم اسکول میں زیر تعلیم تھے اگرچہ یہ وقت بڑا سخت تھا لیکن انہوں نے سخت حالات کے باوجود اپنے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھا اور بعد ازاں وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے قابل فخر طلباء میں شمار ہوئے انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور ساتھ ہی ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ مرحوم میں خطابت کی فطری صلاحیتیں موجود تھیں۔ ان کو کام میں لائے اور علی گڑھ کی تعلیم کے دوران تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور اپنی تقریروں سے مسلم لیگ کا پیغام بھی عام کرتے رہے اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اہم عہدوں پر بھی ذمہ داریاں انجام دیں۔ ادیب اعظم مولانا ظفر حسن صاحب کے بڑے صاحبزادے شمیم الحسن صاحب نقوی مرحوم (سابق سینئر وائس پریذیڈنٹ بی۔سی۔سی۔آئی) آپ کے ہم جماعت تھے۔

پاکستان بنتے ہی یہاں تشریف لائے اور کیوں نہ آتے جس نے پاکستان کے لئے اپنی صلاحیتیں صرف کی ہوں جس کی آرزوؤں اور خواہشوں کا مرکز پاکستان ہو۔ چنانچہ اپنی سرکاری ملازمت کے سبب سے ملنے والے مکان واقع جیکب لائنز میں رہائش اختیار کی لیکن شاید پاکستان آنا انہیں راس نہ آیا، پاکستان آمد کے صرف ایک سال بعد ۲۳ مارچ ۱۹۴۹ء کو مختصر علالت کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ ۲۸ برس کی جوانی میں ان کا انتقال ایک ایسا صدمہ جانکاہ تھا جس نے حقیقتاً ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا اور ہم سب خوشیاں دیکھنے کو ترس گئے۔

ہمارے بھائی سید احمد حسین کی شادی ہمارے چھوٹے دادا کی منجھلی بیٹی سیدہ ابصار فاطمہ کے ساتھ انجام پائی ۔ بھائی کے انتقال سے جہاں ہماری بھابھی جوانی میں بیوہ ہوئیں وہیں ان کے دو بچے سید حامد حسین سلمہ اور سید محمد حسین سلمہ دو یا ڈھائی برس کی عمر میں یتیم ہوگئے۔

اللہ مسبب الاسباب ہے ، وقت سب سے بڑا مرہم ہے جو بڑے سے بڑے داغ کو مٹا دیتا ہے آج ماشاء اللہ بھائی سید احمد حسین کے دونوں بچے اپنے بچوں کے ہمراہ خوشحال ہیں ۔

مرحوم کے بڑے صاحبزادے سید حامد حسین حبیب بینک میں آفیسر ہیں ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے ۔ بڑا بیٹا احمر سلمہ این ۔ ای ۔ ڈی یونیورسٹی کا طالب علم ہے ۔ دوسرا بیٹا شبر سلمہ میڈیکل کالج کا اسٹوڈنٹ ہے جب کہ تیسرے صاحبزادے قنبر سلمہ نے ابھی میٹرک اے ون گریڈ سے پاس کیا ہے جب کہ صاحبزادی عنبر سلمہ میٹرک کی طالبہ ہیں ۔

مرحوم کے دوسرے بیٹے سید محمد حسین دبئ کی ملازمت کے بعد وطن لوٹے ہیں اور اپنے حسن انتظام ، لیاقت ، صلاحیت اور محنت وسلیقے سے ایک اسکول کامیابی سے چلا رہے ہیں ان کا ایک بیٹا اور بیٹی ہے ۔ عون سلمہ اور بتول سلمہ بالترتیب آٹھویں اور میٹرک کے طالب علم ہیں ۔

پروفیسر مولانا سید عنایت حسین جلالوی

سید انعام حسین مرحوم کے منجھلے صاحبزادے اور اپنے بڑے بھائی پروفیسر مولانا سید عنایت حسین جلالوی کے لئے کیا لکھوں کہ گزشتہ برس بہن ریحان فاطمہ کے انتقال کے بعد مولانا کی جدائی یہ ایک نیا صدمہ ہے جو ہم سب پر گذرا ہے۔ انہوں نے جو کامیاب اور لائق تقلید زندگی گذاری اس سے

زمانہ واقف ہے میں نے والد مرحوم کے ذکر میں لکھا تھا کہ ان کے انتقال سے ہماری خاندانی بزرگی اور عظمت کا ایک طرح سے خاتمہ ہو گیا تھا۔ مولانا مرحوم نے ہماری اس خاندانی عظمت کو بحال کیا وہ ہماری خاندانی عظمت رفتہ کے مجدد ہیں ۔ وہ ان چند لوگوں میں ہیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنا خاندانی وقار بڑھایا بلکہ اپنے وطن کی پہچان وشناخت کا ذریعہ بنے۔ " جلالوی " مولانا کے نام کا لازمی لاحقہ بن گیا تھا اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ مولانا " فخر جلالی " ہیں۔ مولانا مرحوم کی شادی اس وقت ہوئی جب آپ مدرسہ ناظمیہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ۔ والد کی عدم موجودگی میں ہمارے بھائی سید احمد حسین نے اور ہماری والدہ احسان فاطمہ مرحومہ نے یہ فریضہ انجام دیا ۔ رئیس جلالی سید محمد حسین کی صاحبزادی نیازفاطمہ سے آپ کی شادی ہوئی ۔ مولانا مرحوم کی تین بیٹیاں اور تین صاحبزادے ہیں تینوں بیٹیاں شادی شدہ ہیں مولانا کی بڑی صاحبزادی نزہت زہرا ، بچپن سے ذاکری کر رہی ہیں ان کے شوہر سید نسیم احمد ممتاز عالم دین ڈاکٹر اعجاز حسین جعفری مرحوم (سابق رکن لاء کمیشن پاکستان) کے بھانجے ہیں اور مسلم کمرشل بینک میں ملازم ہیں گزشتہ دنوں ان کی طویل بینکاری خدمات کے صلے میں گولڈ میڈل بھی دیا گیا ہے ۔

مولانا کی دوسری صاحبزادی رفعت زہرا سلمہ اسکول میں پڑھاتی ہیں آپ کے شوہر سید جاوید اختر سلمہ پاکستان کسٹمز میں پریونٹیو آفیسر کے ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں ۔ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے جو چھوٹے ہیں اور مقامی اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں ۔

چھوٹی صاحبزادی فرحت زہرا سلمہ کے فرض سے مولانا مرحوم اپریل ۱۹۸۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ مولانا مرحوم کے چھوٹے داماد یعنی سید تنظیم

حسین صاحب چارٹرڈ اکاونٹینٹ ہیں اور کامیابی کے ساتھ اپنی فرم چلا رہے ہیں ۔ ان کے ایک صاحبزادے اور دو بیٹیاں ہیں ۔ مصطفین سلمہ اور سبیکہ سلمہ اسکول جاتے ہیں جب کہ چھوٹی بیٹی فہمنیہ ابھی اسکول جانے کی منتظر ہیں۔

مولانا مرحوم کے سب سے بڑے بیٹے سید مصدق حسین سلمہ ایک پرائیوٹ فرم میں ملازم ہیں ، شادی شدہ ہیں اوردو بچیوں کے والد ہیں منجھلے صاحبزادے سید حسن کاظم معاشیات میں ماسٹرز کی ڈگری رکھتے ہیں کچھ عرصے بیرون ملک ملازمت کرکے لوٹے ہیں اور آج کل ایک نجی فرم میں ملازم ہیں جب کہ سب سے چھوٹے صاحبزادے سید سلمان حسین سلمہ ابھی پڑھ رہے ہیں ، ذاکری سے شغف رکھتے ہیں اور اسے آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ بھی ۔

سید بادشاہ حسین شوق جلالوی

راقم الحروف سید انعام حسین مرحوم کا فرزند اصغر ہے ، والد کی وفات کے وقت میں آگرے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا ۔ پاکستان آنے کے کافی عرصے بعد پی آئی اے میں ملازم ہوا اور تاحال وہیں اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں والد کے ورثے کے طور پر تحت اللفظ مرثیے ، پڑھے شاعری سے بھی ذوق ورغبت رہی اور " شوق " تخلص کیا۔ ایک بیٹا راشد حسین سلمہ ہے جو گریجویشن کے بعد پی آئی اے میں ملازمت کر رہا ہے۔

مجالس ترحیم واجتماعات تعزیت

۸ ، اور ۹ ، اکتوبر کی درمیانی شب زعیم ملت استاذالاساتذہ پروفیسر مولانا سید عنایت حسین جلالوی قابل تقلید حیات کے زریں نقوش چھوڑکر اس جہان فانی سے رحلت فرما کر حیات جاودانی میں داخل ہوئے۔ مولانا مرحوم کے سانحہ ارتحال کے بعد مختلف افراد ، تنظیموں اور اداروں کی جانب سے مولانا مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے تعزیتی اجتماعات اور مجالس ترحیم کے سلسلے کا آغاز ہوا جو تاحال جاری ہے ۔ مولانا مرحوم کے احباب وعقید تمند اور ان کے احسانمند مختلف ادارے اور تنظیمیں اپنے اپنے تعلق اور قربت کے حوالے سے ذکر معصومینؑ اور ذکر الہیٰ کے تحفے اور ہدیے ان کی جانب روانہ کر رہے ہیں کہ اب یہی اظہار تشکر اور خدمت کا بہترین طریقہ اور وسیلہ ہے۔

پروفیسر صاحب کے انتقال کی خبر جب ۹ ، اکتوبر کو گورنمنٹ پریمئیر کالج پہنچی (یہاں پروفیسر صاحب نے ۲۰ برس تک نوجوانان وطن کو زیور علمی سے آراستہ کیا تھا اور جہاں سے ۴ ۔ دسمبر ۱۹۹۰ء کو ریٹائر ہوئے تھے) تو پرنسپل پروفیسر علی رضا شاہ نقوی صاحب اور تمام اساتذہ نے مرحوم کے لئے فاتحہ خوانی کی اور پھر پرنسپل صاحب اور اساتذہ مرحوم کی تدفین میں شرکت کے لئے بوتراب جامع مسجد پہنچے۔

مولانا مرحوم کے سوئم کی مجلس سانحہ ارتحال کے اگلے ہی روز یعنی ۱۰ اکتوبر کو بوتراب امام بارگاہ عزیز آباد میں منعقد ہوئی ۔ قرآن خوانی کے بعد سید ابرار حسین صاحب نے سوزخوانی فرمائی ، آل محمد رزمی صاحب نے تعزیتی نظم پیش کی اور حجتہ الاسلام مولانا سید رضی جعفر نقوی صاحب نے خطاب فرماتے ہوئے مولانا مرحوم کی دینی وقومی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا " مولانا مرحوم اسلاف صالحین کی جیتی جاگتی تصویر تھے ، ان کی زندگی معصومؑ کے اس قول کی عملی تفسیر تھی کہ ہمارا محب دنیا میں رہتا ہے تو ہمارے مقصد کی ترویج واشاعت کے لئے اور جب وہ دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو ایک زمانہ اس کے لئے سوگوار ہوتا ہے ، مرحوم کا غم آج صرف ان کے اہل خانہ اور متعلقین کے لئے غم نہیں بلکہ ملت کا غم ہے ۔ " مولانا مرحوم کے سوئم میں ملت جعفریہ کی مقتدر شخصیات ، ذاکرین اہلبیتؑ ، قومی کارکنان ، علمائے کرام اور عقیدتمندوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی ۔

۱۰ ، اکتوبر ہی کو مرحوم کے سانحہ ارتحال کی خبر ٹیلیفون کے ذریعے انڈیا ، عرب امارات اور دور دراز کے متعلقہ حلقوں میں پہنچ گئی ، جہاں ۱۱ ، اکتوبر کو مولانا مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی اور مجالس عزاء کا انعقاد کیا گیا۔

۱۴ ، اکتوبر بروز جمعہ بعد نماز مغربین مسجد تنظیم المومنین میں انجمن تنظیم المومنین کی جانب سے مجلس تعزیت منعقد کی گئی اس مجلس عزاء میں معجز جونپوری صاحب نے سلام پیش کیا ، شفیق حسین دہلوی صاحب نے تعزیتی قطعات پڑھے اور پروفیسر علی امام صاحب نے مجلس عزاء سے خطاب فرمایا۔ آپنے مولانا کی مذہبی خدمات کے حوالے سے کہا کہ " مجلس ملی کے پلیٹ فارم پر میں نے کافی عرصہ مولانا مرحوم کے ساتھ کام کیا اور میں یقین

کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شاید ہی کوئی لمحہ ایسا جاتا ہو جب وہ مجلس ملی کے مرکز سے کسی قومی ضرورت کو پورا کرنے کی فکر میں مبتلا نظر نہ آتے ہوں ۔"

۲۱ ، اکتوبر بروز جمعہ مسجد عسکری دستگیر سوسائٹی میں مولانا مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے مجلس عزاء منعقد کی گئی اس مجلس میں سوزوسلام کے بعد مولانا محمد رضا بیگ صاحب نے " فلسفہ موت وحیات " پر بصیرت افروز تقریر فرمائی ۔

۲۸ ، اکتوبر کو فائیو اسٹار ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام پروفیسر صاحب مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے فائیو اسٹار چلڈرن اکیڈمی نارتھ کراچی میں قرآن حوانی وفاتحہ خوانی کا اہتمام کیا گیا۔ پروفیسر صاحب مرحوم اس ایجوکیشنل سوسائٹی کے سرپرست تھے ، اسکول کے طلباء اور اساتذہ نے قرآن مجید کی تلاوت فرمائی جس کے بعد اسکول کے ایڈمنسٹریٹر سید محمد حسین صاحب نے سوسائٹی کے لئے پروفیسر صاحب کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

۱۱ ، نومبر بروز جمعہ پروفیسر مولانا سید عنایت حسین جلالوی اعلی اللہ مقامہ کے چہلم کی مناسبت سے بوتراب امام بارگاہ میں قرآن خوانی و مجلس عزاء کا اہتمام کیا گیا ۔ بعد از قرآن خوانی سید عابد حسین ہاتف الوری صاحب اور ابرار حسین صاحب نے اپنی پرسوز اور پردرد آواز میں سوزخوانی کی ، پروفیسر سبط جعفرصاحب نے اپنی تعزیتی نظم نذر سماعت کی ، جب کہ عظمت بلگرامی صاحب نے مرحوم کی ذات وصفات کے حوالے سے ایک مہتم بالشان مسدس کی صورت میں خراج عقیدت پیش کیا جس کے بعد مولانا مرحوم کے دیرینہ رفیق اور ہم مکتب، ممتاز الافاضل حکیم باقر حسنین صاحب

قبلہ نے یادگار خطاب فرماتے ہوئے اس دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کو موضوع بنایا آپ نے فرمایا " انسان چلا جاتا ہے لیکن اس کے بعد اس کے اچھے اعمال اس کے لئے اجروثواب کا ذریعہ بن جاتے ہیں ، مولانا سید عنایت حسین جلالوی بھی چلے گئے اب وہ یقیناً ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے کارخیر ان کے لئے صدقہ جاریہ ہیں اور رہیں گے ، مسجد عابدیہ بی ون ایریا لیاقت آباد ، جس کے مولانا مرحوم موسس تھے ، یہ مسجد وامام بارگاہ (بوتراب) جس کی برسوں خدمت انجام دی اور مینجنگ ٹرسٹی رہے ، جامعہ امامیہ ، مسجد جعفریہ گولیمار' یہ سب جب تک قائم ہیں اور جب تک ان مقامات پر کار خیر انجام دیئے جاتے رہیں گے ان کا ثواب مولانا مرحوم کی روح کو ایصال ہوتا رہے گا۔"

مولانا مرحوم کے چہلم کے روز شہر کے حالات انتہائی خراب تھے اور ٹرانسپورٹ نہ ہونے کے برابر تھی اس کے باوجود مومنین ومومنات کی ایک کثیر تعداد نے شرکت فرمائی ۔

۱۷ ، نومبر بروز جمعرات عزاخانہ قبہ سکینہؑ کے مہتمم جناب مہدی حسن صاحب نے مولانا مرحوم کی روح کو تحفۂ ذکر حسینؑ ایصال کرنے کا اہتمام کیا۔ عزاخانہ قبہ سکینہؑ میں منعقد ہونے والی اس مجلس عزاء میں سوزوسلام کے بعد ممتازالافاضل مولانا حکیم باقر حسنین صاحب نے خطاب فرمایا۔

۲۶ ، نومبر کوشاہ کربلا ٹرسٹ رضویہ سوسائٹی نے ڈاکٹر ندیم الحسن شہید اور پروفیسر مولانا سید عنایت حسین جلالوی کے ایصال ثواب کے لئے مجلس عزاء منعقد کی ۔ اس مجلس میں پروفیسر محمد صادق رضوی صاحب نے بصیرت افروز تقریر فرمائی اور حضرت عمار یاسر اور حضرت میثم طمار کے فضائل اور اہلبیت اطہارؑ سے ان کی عقیدت ومحبت کا تذکرہ فرمایا۔ اس مجلس میں

بھی مومنین کی بڑی تعداد نے شرکت کی اور دونوں مرحومین کے لئے فاتحہ خوانی وقرآن خوانی کے ذریعے ایصال ثواب کا اہتمام کیا۔

۲ ۔ دسمبر بروز جمعہ عَلَم کمیٹی (سینٹرل) کراچی کی جانب سے مولانا مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے بعد نماز جمعہ بوتراب امام بارگاہ میں مجلس منعقد کی گئی ۔ اس مجلس میں الحاج سید ضمیر اختر نقوی صاحب نے اپنے مدلل اور وقیع خطاب میں مولانا مرحوم کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ " یہ حقیقت ہے کہ پروفیسر عنایت حسین جلالوی جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوا کرتے ، اورہماری بد قسمتی ہے کہ ایسے یگانہ روزگار لوگ اٹھتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں اور لینا اس لئے بھی مشکل ہے کہ وہ اقدار اب مٹتی جا رہی ہیں ، وہ فکر اب ناپید ہے جس کے تحت جلالوی صاحب ، جیسے لوگ کام کیا کرتے تھے ، ان کے ایصال ثواب کی مجلس میں شرکت کرلینا بڑی بات نہیں ہے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی فکر کو رائج کیا جائے ، ان کے مشن کو آگے بڑھایا جائے۔"

۸ ، دسمبر کو جعفریہ ٹرسٹ (گلبہار) کی جانب سے جعفریہ امام بارگاہ میں مجلس منعقد ہوئی جس سے طریق احمد جعفری صاحب نے خطاب کیا۔

سید احمد اقبال جو مولانا مرحوم کے تلامذہ میں سے ہیں اور آج کل حصولِ علوم دینیہ کے لئے شام کی مقدس سرزمین پر رہائش پذیر ہیں ، انہوں نے مولانا مرحوم کے سانحہ ارتحال کی اطلاع ملنے کے بعد ایصال ثواب کے لئے شریکتہ الحسینؑ بی بی زینب سلام اللہ علیھا کے روضہ اقدس پر مجلس عزاء کا اہتمام کیا۔ اور مولانا مرحوم کی جانب سے ضریح کا طواف بجالائے۔ بیشک

چو عاشقِ حسینؑ ہے اس کو فنا نہیں

اندرون سندھ منعقد ہونے والی مجالس

جامعہ امامیہ کے زیر اہتمام اندرون سندھ کافی تعداد میں مدارس قائم ہیں جہاں نئی نسل کو علوم محمدؐ وآلؑ محمدؐ سے بہرہ مند کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر لوگوں کی مذہبی رہنمائی کی جاتی ہے۔ سندھ کے مختلف اضلاع میں قائم ان مدرسوں میں مولانا مرحوم کے انتقال کی اطلاع ملتے ہی مختلف تاریخوں میں قرآن خوانی اور مجالس کے اجتماعات منعقد کئے اور تحفہ ثواب مرحوم کی روح کو ایصال کیا جن کا ذکر اجمالاً ذیل میں ہے۔

- درگاہ حضرت لعل شہباز قلندر (مہتمم مولانا غلام اصغر نجفی)
- مسجد ومدرسہ جعفریہ بمقام جھنگارا تحصیل سہون شریف ضلع دادو
- بزم ابو طالبؑ بمقام شہداد پور ضلع سانگھڑ
- مسجد ومدرسہ آلؑ محمدؐ بمقام جوھی ضلع دادو (مہتمم مولوی محمد رمضان سیال)
- مدرسہ امام رضاؑ بمقام حسینیؑ بستی چنوبار ضلع دادو

قطعہ تاریخ سال عیسوی

قطعہ

شاہد نقوی

رَہِ طلب میں تھے جو مسافر وہ اپنی منزل پہ آرہے ہیں
سلام کرتے ہیں چاند سورج ، ستارے آنکھیں بچھا رہے ہیں
مریض کروٹ بدل رہا ہے ، صدائے رضواں ابھر رہی ہے
چلو عنایت حسین اٹھو کہ تم کو مولاؑ بلا رہے ہیں

۱۹۹۴ء

قطعہ تاریخ سنہ ہجری

قطعہ

ہوگئی ان پر بھی نگاہِ کرم
کرتے ہیں مومن کی شفاعت حسینؑ
وہ لبِ رضواں پہ تبسم رچا
خلد میں آئے وہ عنایت حسین

۱۴۱۵ھ

میرے استاد

عظمت بلگرامی

(یہ نظم مولانا مرحوم کے چہلم کی مجلس میں پڑھی گئی)

اے قلم بارگاہِ نظمِ عنایت ہے سنبھل
اجرِ احسان ادا کرنا ہے پوشاک بدل
عدلِ ہتذیب میں یہ فصلِ وکالت ہے اٹل
جب مقدمہ ہو قوی تر تو نہ نکتہ سے نکل
بحث حق پر ہو تو انصاف بھی ہوجاتا ہے
مطلعِ باغ جناں صاف بھی ہوجاتا ہے

اصل میں جنتِ کردار تو دنیا ہی میں ہے
رتبہ گاہِ فلک آثار تو دنیا ہی میں ہے
زیست اور موت کی گفتار تو دنیا ہی میں ہے
جیت انسان کی اور ہار تو دنیا ہی میں ہے
یہ جو سانسیں ہیں یہ میزان پہ تلتی ہیں یہیں
زُہد کی جتنی قبائیں ہیں یہ دھلتی ہیں یہیں

میرے استادِ معظم مِرے قبلہ گاہی
نام عنایت ہے، عنایات وکرم کے راہی
ان کو نہ مرغ سے رغبت تھی نہ شوقِ ماہی
وہ فقیری کے مناسک میں تھے حجِ شاہی
دولت دہر تہہِ پائے سخا رکھتے تھے
اپنی ہر سانس میں ہر آن وفا رکھتے تھے

مجھ کو معلوم ہے کتنوں کو دِلائی تعلیم
کتنے لوگوں کو عطا کی ہے قلم کی اقلیم
کتنے بچوں کو تمدن سے بنایا ہے سلیم
سیکڑوں ایسے ہیں جن کے تھے وہ نس نس کے علیم
لیکن اک حرف بھی ہونٹوں پہ نہ احساں کا رچا
ان پہ تاعمر اثر شاہِ شہیداں کا رچا

تختۂ دار سمجھتے تھے وہ اس عالَم کو
وہ سمجھتے تھے کہ بھیجا گیا کیوں آدم کو
وہ غنیمت کبھی سمجھے نہیں دشتِ دم کو
جانتے تھے وہ ہر اک سانس کے زیر و بم کو
نفسیاتِ بشری ان کو بہت آتی تھیں
خواہشیں ان کے قدم چوم کے مر جاتی تھیں

وہ تو سورج تھے مگر مصلحتِ ابر میں تھے
اختیارات کے حامل تھے مگر جبر میں تھے
سید النّسل تھے اور دائرۂ صبر میں تھے
کیونکہ ناقدریٔ حالات کی اس قبر میں تھے
جس نے آلِ دوسرا[۲] کو بھی سہارا نہ دیا
بحرِ ذخّارِ سلونی کو کنارا نہ دیا

ماہِ کامل مِرے استاد کے نقشِ پا ہیں
میرے استاد تشکر کے لئے کعبہ ہیں
علماء کے لئے استاد مرے فتویٰ ہیں
خاتمِ قول پہ رکھا ہوا ایک ہیرا ہیں
جس کی تابانئ علمی سے جہاں چمکے گا
یہ جہاں چیز ہے کیا باغِ جناں چمکے گا

زندگی بھر غمِ ملت میں گرفتار رہے
خرچ ملت پہ ہوئے اتنے کہ نادار رہے
کربلا اور مدینہ کے طلبگار رہے
کبھی اس پار رہے اور کبھی اس پار رہے
تجزیہ ساز تھے، سطوت کا بھرم رکھتے تھے
خانۂ قلب میں شبیرؑ کا غم رکھتے تھے

سیکڑوں مجلسیں صدِ رشکِ سماعت کردیں
خدمتیں درس کی سب نذرِ رسالت کردیں
بے بصر آنکھیں تھیں جو سوئے بصارت کردیں
سانسیں سب حُرؑ کی طرح سمتِ محبت کردیں
قلب کو تھامے ہوئے ابنِ مظاہرؒ کی طرح
وہ بھی دنیا میں رہے پیکرِ طاہر کی طرح

عہدِ آشوب میں استاد مِرے جنت تھے
اتحادِ غمِ اسلام کی ایک وحدت تھے
فقہ جعفریہ گر تن ہے تو وہ طاقت تھے
سر تھے، سرتاج تھے، سرکار تھے اور سطوت تھے
ایک سرمایۂ سرخیل رہے روحوں کا
جس طرح باغ میں انبار ہو خوشبوؤں کا

سیدی اور عنایت وہ حسین اور جلال
چاروں اجزاء کا مرکب تھا وہ ایک شخص کمال
اس کے رکنے میں سلاست تھی تو چلنے میں جمال
اسکے مستقبل وماضی کے تصرف میں تھا حال
منتشر اس نے نہ فطرت کے فسانے رکھے
اپنی مٹھی میں سدا تینوں زمانے رکھے

الغرض اب مِرے استاد ہیں اور باغِ جناں
سایۂ آیۂ تطہیر میں پائی ہے اماں
رحمتیں جوشِ عقیدت پہ ہیں، وہ اب ہیں جہاں
اب ترے دام میں دنیا مرا استاد کہاں
اب تو فردوس میں عظمت کے گلستاں ہوں گے
اب نہ کاکل دلِ بسمل کے پریشاں ہوں گے

رباعیات

عظمت بلگرامی

جتنے ہیں پھول دسترس باغباں میں ہیں
زندہ ہیں اور حرمتِ لفظ وبیاں میں ہیں
پوچھا پتہ جو میں نے عنایت حسین کا
ہاتف نے دی صدا کہ وہ باغِ جناں میں ہیں

آوازِ لطف آئی عزیزوں کے بین پر
یہ شک سے کم نہیں ہے مشیت کے چین پر
کیا یہ وقارِ صدقۂ آلِ عباؑ نہیں
جنت کے در کھلے ہیں، عنایت حسین پر

عالم الرضوی

دنیا پہ چھا گئی ہے قیادت حسینؑ کی
تاحشر اب رہے گی امامت حسینؑ کی
ہے رونقیں یہ منبروں پر ذکرِ کربلا
یہ سب عنایتیں ہیں عنایت، حسینؑ کی

سبط حسن انجم

واحسرتا ! جناب عنایت حسین بھی
پسماندگاں کو داغِ الم مرکے دے گئے
ہیں ڈاکٹر ندیم جہاں ان کے پاس ہی
روحِ روانِ مجلس ملی چلے گئے

مدبّرِ دوراں

نتیجۂ فکر :- پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ھمدانی کمال -
مقیم علی گڑھ انڈیا

افسوس درد قوم کا درماں نہیں رہا
تسکینِ قلب وروح کا ساماں نہیں رہا
کرتا رہا جو دین کی خدمت تمام عمر
دنیا میں ایسا صاحبِ ایماں نہیں رہا
جس کا کلام سننے کے شائق تھے مومنین
وہ کاشفِ حقائقِ عرفاں نہیں رہا
جس نے کیا بلند وقار اپنی قوم کا
عالم میں وہ مدبرِ دوراں نہیں رہا
ایسا خطیب جس سے فروغِ عزا ہوا
ملت میں اب وہ اہلِ دل وجاں نہیں رہا
چودہ سو چودہ ہجری جمادئ اولیٰ کی
سوئم کو اس جہاں کا وہ مہماں نہیں رہا
اعلیٰ تھا علم وفضل کی دنیا میں جو کمالؔ
افسوس اب وہ فرد نمایاں نہیں رہا

جلالویؒ صاحب

سید سبطِ جعفر

محبتوں کے اَمیں تھے جلالوی صاحب
شرافتوں کے اَمیں تھے جلالوی صاحب
تھا ان کا نام عنایت حسین ویسے بھی
عنایتوں کے امیں تھے جلالوی صاحب
خطیب وعالم واستاد و باعمل انساں
فضیلتوں کے امیں تھے جلالوی صاحب
سراپا عاجزی و انکسار و خلق وکرم
مروّتوں کے امیں تھے جلالوی صاحب
نمود ونام ونمائش ، ریا سے کوسوں دور
صداقتوں کے امیں تھے جلالوی صاحب
بھلا نہ پائیں گے احباب واقربا ان کو
قرابتوں کے امیں تھے جلالوی صاحب
گواہ اس کے ہیں محمود وکاظم وعباس
رفاقتوں کے امیں تھے جلالوی صاحب
وہ کیا گئے کہ گئیں گھر کی رونقیں بھی ساتھ
مسرتوں کے امیں تھے جلالوی صاحب
اداس کیوں نہ ہوں سلمان وسبط جعفر بھی
کہ شفقتوں کے امیں تھے جلالوی صاحب

خراج عقیدت

مرتضی علی سحرؔ

مثال کوئی نہیں زیستِ ذاکرِ شہؑ کی
وہ زیست جو کہ گزاری ثنائے حیدرؑ میں
تمام عمر کا حاصل ولائے حیدرؑ تھا
تمام عمر گزاری ولائے حیدرؑ میں

واللہ یہ ہے رتبہ عنایت حسین کا
جنت میں خوش خرام ہیں مولا علیؑ کے ساتھ
ہاں ذاکرِ حسینؑ کی قسمت تو دیکھئے
مجلس میں آئے بھی تو شہِ کربلا کے ساتھ

نشانِ علم کے پیکر جلالوی صاحب
خلوصِ عزم کے دفتر جلالوی صاحب
سحرؔ گئے ہیں جہاں سے ولائے حیدرؑ میں
مثالِ میثم وقنبر جلالوی صاحب

خراج عقیدت

ناصرہ گوہر عابدی

کتاب زیست کے اوراق کھولنے والو !
ہمارے سر سے محبت کا سائبان گیا

وہ ایک ذات کہ ہم جس پہ فخر کرتے تھے
وہ بردبار مجسم جو صبر کرتے تھے
کسی پہ حکم مسلط نہ جبر کرتے تھے
علوم وفن کی دل وجاں سے قدر کرتے تھے

کتاب زیست کے اوراق کھولنے والو !
ہمارے سر سے محبت کا سائبان گیا

وہ طبع جن کی فقط خدمت وعبادت تھی
وہ حسن زور بیاں کیا فقط خطابت تھی ؟
کسی سے بغض وحسد نہ کوئی عداوت تھی
مجھے تو ان سے عقیدت تھی اور چاہت تھی

کتاب زیست کے اوراق کھولنے والو !
ہمارے سر سے محبت کا سائبان گیا

نہ مال وزر کی تمنا نہ دنیوی ارمان
پسر ہیں ان کے مصدق حسن بھی اور سلمان

کہاں ملیں گے عنایت حسین سے انسان
وفات ان کی ہمارا بہت بڑا نقصان

کتاب زیست کے اوراق کھولنے والو !
ہمارے سر سے محبت کا سائبان گیا

عباس شہیر

رباعیات

(مرحوم کے آخری دیدار کے وقت کہی گئی)

ہے نبض رواں اور سُکوں کا پہرہ
گو کربِ شبِ تار نہایت گہرا
یہ موت ہے ؟ دیکھو آؤ دیکھو !
تابندگیٔ زیست سے روشن چہرہ

اَنفاس کا چشمہ سُوئے عُقبیٰ چُھوٹا
اَفلاک نے گنجینۂ عِلمی لُوٹا
رحلت یہ عنایت کی نہیں دستِ فلک
اس قوم سے اک اور سہارا چُھوٹا

گردوں پسند ساکنِ ہفت آسماں ہوا
جنت کا فرد تھا سو وہ جنت نشاں ہوا
صلِ علیٰ کی گونج میں ماتم کی چھاؤں میں
ابنِ انعام شاملِ آزادگاں ہوا

رباعیات

سید شفیق حسین زیدی دہلوی
تعزیتی مجلس کے دوران یہ رباعیات پڑھی گئیں

خامشی میں فکر کی فضا پائی
سادگی میں نفس کی جلا پائی
میں عنایت جلالوی کو اتنا سمجھا
ولائے آلؑ نبیؐ میں مَرے ، بقا پائی

آلِ عباؑ سے نقشِ شفاعت لئے ہوئے
ذکرِ غمِ حسینؑ کی عظمت لئے ہوئے
منکر نکیر قبر میں پہنچے تھے مطمئن
کوثر کا جام بہرِ عنایت لئے ہوئے

ظفر عباس ظفر

تھا انکا رابطہ جو شہِ خاص وعام سے
وہ بانٹتے تھے علم کے گوہر کلام سے
دنیا سے اُٹھ گئے جو عنایت جلالوی
" جا کر ملے حسینؑ علیہ السلام سے "

PHONE. 6684427

JAFFERIA TRUST

HOUSE No. 429,
HUSSAINABAD, GOLIMAR,
KARACHI.

Your Ref. ____________

Our Ref. ____________

Date: 8. 12. 1994

مولانا عنایت حسین جلالوی کے انتقال پر تعزیتی اجلاس

مجلس عزاء

جعفریہ ٹرسٹ حسین آباد گلبہار گولیمار کراچی کا
تعزیتی اجلاس ذاکر اہلبیت عالیجناب مولانا عنایت حسین جلالوی صاحب کے انتقال
پُرملال پر زیر صدارت زیر صدارت عالیجناب **سید محمود الحسن رضوی** صاحب منعقد ہوا
تعزیتی اجلاس میں مولانا عنایت حسین جلالوی صاحب کی موت کو ایک عظیم سانحہ قرار دیا گیا۔
جعفریہ ٹرسٹ حسین آباد گلبہار کراچی کے جناب **سید طارق احمد جعفری** نے مولانا کی
موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم امام بارگاہ جعفریہ حسین آباد گلبہار
میں ۲۵ سال سے مجالس عزا سے خطاب کرتے رہتے ہیں مولانا کی شخصیت پاکستان
کے لئے ناقابل فراموش ہے مرحوم کی خدمات اسلام کے لئے قابل قدر ہیں مولانا نواب
سلیمہ ذہین کے مالک تھے سید طارق جعفری نے تعزیتی اجلاس میں تعزیت کرتے ہوئے
کہا کہ علامہ کی موت سے جعفریہ ٹرسٹ کے تمام اراکین کو دلی صدمہ ہوا ہے
انہوں نے کہا کہ مولانا ایک قابل فخر استاد الشعراء بلند پایہ مقرر خطیب اہلبیت
اطہار کی ذکر رکھنے والے عالم دین تھے۔ تعزیتی اجلاس میں جعفریہ ٹرسٹ گلبہار میں
دعا کی گئی مولانا مرحوم کو پنجتن پاک کے صدقے میں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے
اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ جعفریہ ٹرسٹ حسین آباد گلبہار گولیمار کی
جانب سے مجلس عزا کا انعقاد مرحوم مولانا عنایت حسین صاحب جلالوی کے ایصال ثواب کے
لئے امام بارگاہ جعفریہ حسین آباد میں ۸ دسمبر ۹۴ کو کیا گیا جس میں
تمام مومنین نے شرکت کی۔

سید طارق جعفری

S. TAREEQ JAFRI
TRUSTEE
JAFFARIA TRUST
Hussainabad Gulbahar Karachi-18

BUTURAB SCOUTS GROUP

Affiliated with,

SIND BOY SCOUTS ASSOCIATION, KARACHI

CONTROLLED BY:
BUTURAB SCOUTS CONTROL COMMITTEE
IDARA GHULAMAN-E-BUTURAB PAKISTAN REGD.
(ESTD - IN 1952)

CENTRAL HEAD OFFICE:
PLOT ST I
BLOCK NO. 8 AZIZABAD
F. B. AREA KARACHI-38

Our Ref. BSCC/786/94

Date: 21-x-94

To
Mr. Hassan
Karachi.

Condolence Message

Dear Sir,

The Executive Body and all the members of Buturab Scouts Group are deeply grieved to learn of the sad demise of your beloved Father Syed INAYAT HUSAIN (Inna-Lillahe-Wa-Inna-Elaihe-Rajeoon) and offers their heart felt condolence on this sad demise.

We all pray to Almighty Allah to keep the departed soul in Eternal peace, and to give courage to the members of the family to bear this irreparable loss. Ameen.

Your Sincerly

ZULFIQAR Hussain
(secretary General)
BUTURAB SCOUTS GROUP

Jama-i-Imamia
(trust)

جامعہ امامیہ (وقف)
(مدرستہ الواعظین)

Block No. 2, Nazimabad,
KARACHI.

Ref No ______

Date 25-11-86

جامعہ امامیہ ٹرسٹ کا ایک جلسہ بہ زیر صدارت ادیب اعظم
مولانا سید ظفر حسن صاحب مرحوم منعقد ہوا جس میں مولانا سید عنایت حسین صاحب جلالوی (مرحوم)
منیجنگ ٹرسٹی جامعہ امامیہ اور بانی مجلس علمی کی روح کے ایصال ثواب
کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی اور مرحوم کی بے لوث گراں قدر خدمات
کو سراہا گیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کی گئی کہ مرحوم کو فردوس بریں
میں جگہ عطا کرے اور مرحوم کے لواحقین اور ہم سب کو صبر جمیل
عطا کرے (آمین)

سید شبیہ الحسن نونہروی

فون: ۷۷۲۳۶۳۱ ، ۷۷۲۳۳۰۷

انجمن اساتذہ

وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی

حوالہ نمبر ________ تاریخ ۲۵ / اکتوبر / ۱۹۹۲ء

پروفیسر سید عنایت حسین جلالوی مرحوم ایک بزرگ استاد اور بلند پایہ عالم دین تھے۔ وہ عالم باعمل تھے، اساتذہ برادری میں اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ ان کی دینی اور تدریسی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

پروفیسر سرور علی قریشی
جائنٹ سیکریٹری

786 ☎ 6314069

BUTURAB JAME MASJID & IMAM BARGAH TRUST

بوتراب جامع مسجد و امام بارگاہ ٹرسٹ

عزیزآباد کراچی نمبر – ۳۸

Controlled by
IDARA GHULAMAN-E-BUTURAB PAKISTAN
REGD
(Estd in 1952)

AZIZABAD
BLOCK No. 8,
FEDERAL 'B' AREA,

Our Ref : ______________ Karachi-38 یکم نومبر ۱۹۹۴

موت العالِم موت العالَم

مرحوم مولانا سید عنایت حسین جلالوی سابقہ منیجنگ ٹرسٹی بوتراب ٹرسٹ عزیز آباد

ہم اراکین بوتراب جامع مسجد و امام بارگاہ ٹرسٹ مولانا سید عنایت حسین جلالوی کے انتقال پر ملال پر رنجیدہ و غمگین ہیں اور تمام اراکین بوتراب جامع مسجد و امام بارگاہ ٹرسٹ مرحوم کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اور دعا گو ہیں کہ رب جلیل مرحوم کو بہ طفیل محمدؐ و آل محمدؐ درجات بلند فرمائے اور جوار معصومین میں جگہ عنایت فرمائے اور انکے کار ہائے خیر کا صلہ میں اجر جزیل عطا فرمائے آمین۔

مولانا پروفیسر عنایت حسین جلالوی قبلہ انتہائی مخلص باوفا، باکردار اور ممتاز عالم دین ذاکر اہلبیتؑ بھی تھے۔ اور اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود ہمارے ٹرسٹ میں بحیثیت منیجنگ ٹرسٹی خدمات انجام دیں۔ اور اراکین کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کو ہمیشہ قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے مرحوم کی خدمات ہمارے ٹرسٹ کے لئے ناقابل فراموش ہیں اور ان کے مشورے مشعل راہ ہیں۔ مولانا مرحوم ہر ادارہ اور ہر شخص کی خدمت کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتے تھے۔ مولانا مرحوم کے بچوں اور پسماندگان کے لئے ہمیں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انکو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کی سیرت پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے خصوصاً انکے چھوٹے صاحبزادے جناب سلمان جلالوی کو ان کی سیرت، کردار، علم اور انداز خطابت سے سرفراز فرمائے اور ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ آمین

1-11-94

منجانب منیجنگ ٹرسٹی و اراکین بوتراب جامع مسجد و امام بارگاہ
ٹرسٹ عزیز آباد

شاہِ کربلا ٹرسٹ

20-11-96

جناب بیگم صاحبہ پروفیسر عنایت حسین صاحب جلالوی مرحوم و صاحبزادگان
لیس آباد ۔ کراچی

سلام مسنون

بورڈ آف ٹرسٹیز شاہ کربلا ٹرسٹ کا ایک جلسہ بروز جمعرات بتاریخ 17 نومبر ۱۹۹۶ء بوقت 7.30 بجے شب بمقام دفتر ٹرسٹ منعقد ہوا جس میں جناب پروفیسر عنایت حسین صاحب جلالوی مرحوم کے لئے فاتحہ خوانی ہوئی اور مرحوم کے لئے مغفرت کی دعا مانگی گئی۔ پروفیسر صاحب مرحوم کے انتقال پُر ملال پر تمام ٹرسٹی حضرات کو صدمہ عظیم ہے اور تمام ٹرسٹی حضرات آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ ہم پھر دعا کرتے ہیں کہ خداوند عالم مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور انکے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے

مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے ٹرسٹ کی جانب سے ایک مجلس عزا بروز ہفتہ بتاریخ 26 نومبر ۱۹۹۶ء بعد نماز مغربین بمقام مسجد شاہ کربلا رضویہ سوسائٹی منعقد کی جارہی ہے جس سے جناب مولانا سید رضی جعفر صاحب قبلہ خطاب فرمائیں گے۔

آپ سے گذارش ہے کہ مرحوم کے اعزہ و اقربا، دوست و احباب کو مطلع فرمادیں تاکہ کثیر تعداد میں مومنین شرکت فرماکر مرحوم کے لئے فاتحہ پڑھیں اور انکی روح کو ثواب پہونچائیں

SYED AFZAL MEHDI
Honorary Addl. Managing Trustee

Maher H. Alavi

December 21, 1994

REF:MHA/2267/94

MESSAGE

I consider this as my singular honour to associate myself in the remembrance of Moulana Syed Inayat Hussain Jalalvi.I had the privilege of meeting him for the first time when a group of people called on my late father Mr.Hatim A. Alavi to seek his support for giving redress to the grave injustice that had been done to some of the residents of Khairpur district.

The dedication and devotion with which Moulana Saheb expressed his views not only on this particular subject but on all similar issues has left a lasting impression on me. He was fearless and always available to support a just cause.

Moulana Saheb indeed was a true follower of Moula Mushkil' Kusha Hazrat Ali. I pray that his soul is in the company of the Good and Elated people of this world.

Maher Alavi

CORNER HOUSE, PREEDY STREET, KARACHI-74400 PAKISTAN
TEL: Off: 516169 Res: 5868291 FAX: (021) 5682724 - TELEX: 29624 ALAVI PK - CABLE: QUALITY KARACHI.

بسمہ تعالیٰ

تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان

ہیڈ کوارٹر، علی مسجد سٹیلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی فون: ۴۲۱۳۲۰، ۴۱۰۱۸۰

تاریخ: 27-10-94

برادر محترم سلمان جلالوی صاحب

سلام مسنون! ھدیہ یا علیؑ مدد

مزاج گرامی نیک مطلوب

ضروری امر قابل تحریر یہ ہے کہ سید محمد آصف زیدی صاحب کے فون کے توسط سے آپکے والد بزرگوار محترم قبلہ مولانا عنایت حسین جلالوی کی وفات کا سنکر دلی افسوس ہوا۔ قائد ملت جعفریہ پاکستان آغا سید حامد علی موسوی نے اس سانحہ پر دلی تعزیت کا اظہار فرمایا ہے اور دعا گو ہیں کہ خداوند عالم مرحوم کو جوارِ سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام میں جگہ عطا فرمائے اور تمام سوگواران کو صبر سید سجادؑ سے نوازے۔ آمین۔

ہمارے تعزیتی جذبات قبول فرمائیں۔ چہاردہ معصومینؑ آپکے حامی و ناصر ہوں اور سوائے غم حسینؑ آپکو کوئی غم نہ ہو۔ آمین۔

والسّلام

شریکِ غم

سید قمر حیدر زیدی

(مرکزی سیکرٹری اطلاعات)

تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان

ہیڈ کوارٹر علیؑ مسجد سٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی

٦٨٣٠٢٥ ☎
✆: 68 30 25

المرجع الدینی آیۃ اللہ العظمیٰ عماد العلماء پاکستان
مجتہد اعظم

علامہ السید محمد رضی التقوی الرضوی

نبیرہ و جانشین حضرت صدر الشریعۃ آیۃ اللہ العظمیٰ شمس العلماء سرکار نجم الملۃ ‌"ستارہ امتیاز"

C-96, Block 10, Federal "B" Area, Karachi No-75950

Ref.No.__________ Date. 21-10-94

باسمہ سبحانہ

مولانا سید عنایت حسین جلالوی مرحوم میرے ہزاروں شاگردوں میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے، وہ ناظمیہ عربی کالج لکھنؤ کے فارغ التحصیل تھے جہاں میں دس برس تک وائس پرنسپل رہا تھا۔ وہ بہترین ادیب و خطیب تھے، وہ قومی اور مذہبی مقبول رہنما تھے۔ جب میں تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں کراچی مستقل طور پر آگیا تھا تو اسکے کچھ عرصہ بعد وہ بھی یہاں آگئے اور ہر قومی و علمی تحریک میں میرے ساتھ رہے، جب میں نے آل پاکستان حسینی ایجوکیشنل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تو اس میں بھی وہ میرے ساتھ تھے اور جب میں نے حسینی سوسائٹی کی طرف سے حسینی سکنڈری اسکول کا افتتاح کیا تو عرصہ تک اس میں وہ مدرس رہے، سوسائٹی کی طرف سے ایک ماہانہ مجلہ "ساحل" جاری ہوا تو اُسکے مدیر بھی رہے، شاید وہی زمانہ تھا جب وہ جناب حمید ڈی حبیب دام مجدہ کو اردو زبان کی تعلیم دیا کرتے تھے، وہ اتحاد بین المسلمین کے حامی تھے اور ملکی مسائل میں بھی ایک معزز رہنما کی حیثیت سے مقبول تھے، وہ کراچی کے ایک مشہور کامرس کالج میں [illegible] پروفیسر بھی عرصہ تک رہے، وہ "مجلس ملی" کے بانی اور سربراہ بھی رہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی علمی تاریخ میں اُن کا نام ہمیشہ تابناک رہے گا۔ بلاشبہ وہ علم و اخلاق حسنہ کا بہترین نمونہ تھے، اللہ جل شانہ اُن کی روح پاک کو فردوس بریں میں، جوار محمد و آل محمد علیہم السلام میں جگہ عطا فرمائے آمین/ اور اُن کے پسماندگان کو اُن کا بہترین جانشین قرار دے اور اُن کی ہر قدم پر نصرت و مدد فرمائے۔

محمد رضی الرضوی
نبیرۂ سرکار شمس العلماء حضرت نجم الملۃ طاب ثراہ

سرخیل کاروانِ مجلس ملی

حجۃ الاسلام علامہ سید رضی جعفر نقوی

علم انسانیت کے سرکا وہ تاج ہے جس کی عظمت کبھی کم نہیں سکتی اور اولاد آدمؑ کی پیشانی کا یہ وہ جھومر ہے جس کی چکاچوند کبھی ماند نہیں پڑسکتی اور ظاہر ہے کہ جسے مالک دو جہاں نے انسان کی سربلندی کا روشن ستارہ قرار دیا ہو اسی کی تابندگی و درخشندگی کو کون کم کرسکتا ہے۔

بقول شاعر

علم بخشا خدا نے آدم کو
علم سے جگمگا یا عالم کو
علم خود آگہی کا زینہ ہے
علم جینے کا اک قرینہ ہے

جب علم کا تاج تمام انسانوں کے مورث اعلیٰ حضرت آدمؑ کے سر مبارک پر رکھا گیا تو پوری کائنات نے یہ منظر دیکھا کہ:

عبادت سجدہ ریز نظر آرہی تھی اور علم مسجود ملائک قرار پا رہا تھا۔۔۔۔ اور اللہ کا پہلا نمائندہ سلسلہ ہدایت کی پہلی کڑی، پہلا خلیفتہ اللہ فی الارض جب زمین پر بھیجا جا رہا تھا، تو اگرچہ اس وقت پوری دنیا میں وہ اکیلا انسان تھا، خداوند عالم زمین کے تمام خزانے اس کے سپرد کرسکتا تھا، سیم وزر سے اس کے دامن کو بھر سکتا تھا، مادر گیتی کو یہ حکم دے سکتا تھا کہ تمام معدنیات کو الہیٰ نمائندے کے قدموں پر انڈیل دو اور تمام جنات و ملائک کو یہ پیغام سنایا جاسکتا تھا کہ آدم کو زمین پر بادشاہ بنا کر بھیجا جارہا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ نہ ہوا بلکہ علم کی افضلیت وشرف کو یہ کہہ کر

نمایاں کیا گیا کہ:

وعلم آدم الا سماء کلھا

(آدمؑ کو تمام اسماء کا علم دے دیا)

بقول شاعر

علم ہی لوح وقلم حرف ونوا صدق ویقیں
علم کے حلقہ بگوشوں میں ہیں جبرئیل امیں
علم کے در پہ جھکاتے ہیں مہ ومہر جبیں
علم کے باب سے ہٹ کر نہ زماں ہے نہ زمیں
سر بستر ہو تو یہ حق کا ولی ہوتا ہے
کربلا ہو تو حسینؑ ابن علیؑ ہوتا ہے

اور دنیا بھر کے تمام لوگوں کو صاحبان علم ہی کی طرف رجوع کرنے کا مالک دو جہاں نے حکم دیا ہے جیسا کہ ارشاد قدرت ہے

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون

اگر تم نہیں جانتے تو صاحبان ذکر (اہل علم) سے پوچھو

اور سورہ مبارکہ المجادلہ میں یہ بات بالکل واضح الفاظ میں بیان کر دی گئی کہ پروردگار عالم ہر دور اور ہر عصر میں صاحبان علم وایمان ہی کو بلند رکھے گا، جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔

ویرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات

(تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جنہیں علم کی دولت عطا ہوئی ہے، ان کو اللہ بلند درجات عطا فرمائے گا۔

علم عرفان و خبر حکمت و وحی و الہام
علم جذبے کی قبا علم خرد کا احرام
علم والفجر کی تنویر جہاں تاب کا نام
علم واللیل کی خوشبو میں بسائی ہوئی شام
قاب قوسین کی منزل یہی سر کرتا ہے
ایک لمحے میں یہ صدیوں کا سفر کرتا ہے

اور علم کی اسی عظمت وجلالت کو بیان کرتے ہوئے حضرت امیرالمومنین ، امام المتقین یعسوب الدین ، امام المشارق والمغارب اسد اللہ الغالب حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :

رضینا قسمة الجبار فینا
لنا علم وللجهال مال
فان المال یفنی عن قریب
وان العلم باق لایزال

خدا وند عالم کی اس تقسیم پر ہم راضی ہیں کہ اس نے ہمیں علم دیا اور جاہلوں کو مال دے دیا ، کیونکہ مال عنقریب ختم ہونے والی چیز ہے لیکن علم تو باقی رہنے والی وہ دولت ہے جس کے لئے کبھی زوال نہیں ہے ۔

اور جس ذات میں علم اور تقویٰ دونوں چیزیں جمع ہوجائیں اس کی عظمت وجلالت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ سرکار قائم آل محمدؐ حضرت امام زمانہ علیہ السلام نے اس زمانۂ غیبت میں ان ہی لوگوں کو اپنا

نائب اور جانشین برحق قرار دیا ہے جو علم اور تقویٰ کے اعلیٰ ترین منصب فائز ہوں ۔

بلکہ امام ششم حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے منقول حدیث کے مطابق تو ہم اگر کسی شخص کی بارگاہ امامت میں قبولیت ومنزلت کو سمجھ چاہتے ہیں تو اس کا واحد راستہ ہی علم وتقویٰ ہے ۔چنانچہ امامؑ فرماتے ہیں کہ

" سچا عالم دین وہ ہے جس کی زندگی میں حضرت محمدؐ وآلؑ محمدؐ کی سیرت وکردار کی جھلک نظر آئے "

(مفہوم ملخص)

یہی وجہ ہے کہ ملت جعفریہ نے عہد غیبت کے اس (تقریباً) ۱۲ سو سالہ طویل دور میں اپنے علماء کی شناخت کا واحد راستہ علم وتقویٰ ہی کو سمجھا ہے اور یہی درویش صفت علماء تھے جنہوں نے زمانہ کی ہر قسم کی سختیوں کا سامنا کرتے ہوئے حق کے چراغ کو روشن رکھا ۔

عالیجناب مولانا سید عنایت حسین جلالوی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ جنہیں مرحوم کہتے ہوئے دل زخمی ہوتا ہے ، اسلاف کی ان ہی جیتی جاگتی نشانیوں میں سے تھے جنہوں نے علم وآگہی کے ساتھ تقویٰ وپرہیزگاری کو ہی زندگی کا عظیم الشان معیار سمجھا ۔

آپ کی پوری زندگی عروس علم کے گیسوؤں کو سنوارنے میں گزری اور قومی زندگی کے اہم ترین مسائل آپ کے فکر وخیال کا محور بنے رہے جس کی خاطر آپ نے " مجلس ملی " جیسے عظیم قومی ادارہ کی بنیاد رکھی جس میں اگرچہ آپ کے علاوہ بھی متعدد گرانقدر شخصیتیں شامل ہیں ۔ لیکن اگر آپ کی ذات والا صفات کو اس قومی ادارہ کا " روح رواں " کہاں جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

یہ بات بھی بڑے رنج وغم کی ہے کہ مجلس ملی کے پلیٹ فارم پر جو وگراں قدر شخصیتیں سب سے نمایاں نظر آتی تھیں ، ۱۹۹۴ ء میں ہم ان دونوں ہی گراں بہا شخصیتوں سے محروم ہوگئے ، ماہ اپریل میں ڈاکٹر ندیم الحسن صاحب مرحوم کی دردناک شہادت کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ صرف ساڑھے پانچ ماہ بعد اکتوبر کے مہینہ میں معظم ومکرم جناب مولانا سید عنایت حسین جلالوی صاحب طاب ثراہ بھی اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرماگئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم کے فرزندوں نے ان کے چہلم کے موقع پر ایک گرانقدر علمی فکری مجلہ شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ پروردگار عالم مولانا سید عنایت حسین جلالوی صاحب طاب ثراہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مراتب عطا کرے ، ان کے فرزندوں کو صبر جمیل عطا کرے اور ان کے تمام ماندگان نیز برادر خورد ورفقائے کار کو ہمت وطاقت عطا کرے کہ " مجلس ملی " کی بنیاد رکھتے ہوئے جس شاندار قومی منصوبے کو مولانائے مرحوم نے پیش نظر رکھا تھا ، سب مل کر اسے پایۂ تکمیل کو پہونچائیں اور ملت کے مسائل کا دوررس حل تلاش کرکے سرکار امام زمانہؑ کی خوشنودی حاصل کریں۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

کثیر الجہات مصروفیتوں کے انسان

پروفیسر کرار حسین

جلالوی صاحب سے ملاقات کا اتفاق گاہے گاہے کسی فکری یا مذہبی تقریب میں ہوتا تھا ۔ مجھے تو بروقت ان کے سانحۂ ارتحال کا بھی علم نہ ہوسکا ۔ عزیزم سبط جعفر نے جب مجھے یہ اندوہناک خبر سنائی تو مولانا کی شبیہ اپنی پر خلوص مسکراہٹ کے ساتھ میرے تصور میں ابھر آئی ۔ مولانا کی شخصیت میں کچھ ایسی خصوصیت تھی کہ باوجود بہت کم ملاقات ہونے کے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ بہت پرانے رفیق ہیں ، اس خصوصیت کا اظہار ان کی وہ پر کشش مسکراہٹ تھی جو ان کی شخصیت کا ایک لازمی جزو بن گئی تھی اور جس کے بغیر ان کی شبیہ کا تصور ناممکن ہے۔

مولانا پروفیسر سید عنایت حسین جلالوی ایک کثیر الجہات مصروفیتوں کے انسان تھے ۔ فرائض منصبی کی ادائیگی ایک طرف ، معمول کی رسمی عبادات کا انتظام ، عبادت گاہوں کا اہتمام ، تقریبات کا انعقاد ، فکری اور علمی اجتماعات میں شرکت ، معاشی اور سماجی معاملات میں مشاورت ۔۔۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اور ہر محاذ پر مولانا ایک خدمت کے جذبہ کے ساتھ موجود ، اس جذبہ کے خلوص اور گہرائی کا یہ اعجاز تھا کہ مولانا جتنی خاموشی اور جس قدر عجز وانکسار کے ساتھ کام کرتے تھے اتنے ہی نمایاں اور ممتاز نظر آتے تھے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ مولانا اکثر اداروں کے انتظام واہتمام سے وابستہ تھے۔ لیکن ذاتی طور پر مجلس ملی کے حوالے سے ان کی خدمات کا مشاہدہ مجھے بھی رہا ہے وہ ایک غیر پیشہ ور خطیب تھے ان کے خیال وبیان میں روشن خیالی اور رواداری کی صفات نمایاں تھیں ، وہ اپنے تمام رفقائے

کار کی نظروں میں اور ہر مکتبِ خیال کے نزدیک بڑی قدر ومنزلت رکھتے تھے ۔
اللہ تعالیٰ جوار معصومینؑ میں ان کو جگہ دے ۔ بیشک قومی زندگی میں ان کی جگہ پُر ہونا آسان نہیں ۔

ایک خوش بیان خطیب

علامہ طالب جوہری

حضرت مولانا پروفیسر عنایت حسین جلالوی اعلی اللہ مقامہ کا ارتحال ایک عظیم قومی سانحہ ہے ۔ مولانا ایک خوش بیان خطیب ، ایک تجربہ کار معلم اور قوم کے وہ عظیم کارکن تھے جنہوں نے ربع صدی تک سنگ بنیاد کی طرح پس پردہ رہ کر قوم کی فکری ، معاشرتی او رسیاسی تربیت اور رہنمائی میں حصہ لیا ۔

میں مولانا مرحوم کی زندگی میں ذاتی طور پر ان کا نیازمند رہا اور ان کی خوش اخلاقی ، صداقت بیانی اور ایثار ومروت کے جذبات کا قائل رہا۔۔۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ الفاظ اپنے معانی کھو چکے ہیں۔۔۔۔ ایسے لوگ جو اپنے کردار گفتار سے ان الفاظ کو معانی پہناتے ہیں وہ لائق صداحترام وستائش ہیں اور مرحوم ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

میں خداوند عالم کی درگاہ میں دست بدعا ہوں کہ خدائے قدوس بہ طفیل محمدؐ وآلؐ محمدؐ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کے ممدوحین کے جوار میں جگہ عطا فرمائے اور ورثا وپسماندگان کو صبر جمیل مرحمت کرے ۔

جب احمدؐ مرسل نہ رہے کون رہے گا

مولانا سید جواد الاصغر نقوی (صدر الافاضل)

یہ حقیقت ہمیشہ سے ناقابل انکار رہی ہے اور ہے اور تاقیامِ قیامت رہے گی جب سے اس ارض خاکی پر نوع بشر کے جد اعلیٰ زینت دہ دنیائے دوں ہوئے ہر ذی حیات کیلئے حیات وموت کا ایک تسلسل قائم ہے اس دنیا کا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس میں کچھ ذی حیات کی آمد نہ ہوتی ہو یا کچھ صاحبان حیات موت کا مزہ نہ چکھتے ہوں۔

اسی طرف خالق کائنات نے اشارہ کیا ہے کہ "کُل نفس ذائقۃ الموت" اور موت اک ایسا یقینی امر ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ آپ کو دنیا میں ایسے حضرات تو مل جائیں گے جو خالق کائنات کے وجود پر یقین نہ رکھتے ہوں لیکن ایسا کوئی فرد آپ کو نہیں ملے گا جو موت پر یقین نہ رکھتا ہو۔لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ خالق کائنات نے نوع بشر کے پہلو میں ایک صنوبری شکل کا ایسا عضو رکھا ہے جسے قلب اور دل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسے حساسیت کا مرکز بنا دیا ہے جو ہر نئے آنے والے کی آمد پر بے حد مسرور بھی ہوتا ہے اور ہر چلے جانے والے کی جدائی پر بے حد المناک وغمناک بھی ہوجاتا ہے۔ اور کبھی کبھی بعض غم واندوہ ایسے ہوتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگتا ہے لیکن پھر قدرت کا یہ احسان ہے کہ اس نے انسان کو مادہ نسیان بھی عطا کر دیا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو جو کیفیت انسان کی غم والم کی ابتداء میں ہوتی ہے اگر وہی باقی رہ جاتی تو انسان کے لئے جینا دشوار ہی نہیں بلکہ غالباً محال ہوجاتا۔ لیکن اس غم واندوہ کی بعض کیفیتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ انسان اس مادہ نسیان کے ذریعہ بہت آسانی سے اور بہت جلد قابو پالیتا ہے لیکن بعض غم ایسے ہوتے

ہیں کہ جہاں یہ مادہ سیارہ بھی بے بس نظر آنے لگتا ہے اور یہ صورت حال ہر فرد بشر کے لئے پائی جاتی ہے ، اور مثلاً میں کہ اس وقت زندگی کے بہترویں سال سے گزر رہا ہوں اور اس عرصہ میں نہ جانے کتنے ہی غمِ جدائی اٹھائے ہوں گے لیکن بعض غم میرے لئے ایسے قلب ودماغ پر مرتسم ہوگئے ہیں کہ باوجود کوشش میرے دل سے اس کی ٹیسیں نہیں جاتی ہیں ۔ مثلاً پروفیسر مولانا منور علی صاحب یا جناب ضیاء احسن موسوی صاحب یا خوجہ برادری میں سے جناب اکبر علی رامی پیتھا مرحوم یا حاجی محمد حسین صاحب مرحوم کے جن سے میرا صرف قلبی لگاؤ ہی نہیں تھا بلکہ میں انہیں اپنے محسنین میں شمار کرتا ہوں۔ اس وقت ازسرنو ان کی یادیں اس لئے سا رہی ہیں کہ ابھی ابھی ایک ایسے ہی غم جدائی سے پھر دوچار ہونا پڑا ہے کہ شاید یہ غم بھی مدتوں بھلا نہیں سکوں گا اور وہ ہے اپنے حبیب پروفیسر مولانا سید عنایت حسین جلالوی کا غم جدائی ، یوں تو مولانا سے میری گاہے گاہے کی ملاقات طالب علمی کے زمانہ سے تھی وہ لکھنو میں عظیم دینی درسگاہ جامعہ ناظمیہ کے طالب علموں میں تھے میں جامعہ سلطان المدارس لکھنو کا طالب علم تھا لیکن کراچی آنے کے بعد جب میں نے اپنی قومیات میں حصہ لینا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے ایک عظیم رکن مولانا عنایت حسین جلالوی بھی ہیں۔ اور پھر اس سلسلہ میں جب ملاقاتوں میں تسلسل پیدا ہوگیا تو میں نے محسوس کیا کہ ہم میں اور مولانا میں بڑی ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اکثر قومی مسائل میں ہماری اور ان کی فکر ایک ہی جیسی ہوتی تھی ۔ پھر ذہنی ہم آہنگی نے ہم دونوں کو اور قریب کردیا اس ذہنی ہم آہنگی کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ ہماری اور ان کی سادہ مزاجی اور انکسارانہ روش بھی ایک جیسی تھی ۔ اس کے علاوہ اس انکساری کے ساتھ خودداری بھی پرلے درجہ کی تھی مہاجری کی ابتدائی زندگی ہم نے بھی اور مولانا نے بھی نہایت مشقت اور

تعب کی گزاری لیکن کیا مجال ہے کہ کبھی کوئی حرف شکوہ زبان پر آئے۔ یا کسی کے سامنے اپنی پریشانی کا اظہار کریں یا کسی صاحب ثروت کے ممنون احسان ہونے کی کوشش کریں۔ پھر آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایسی شخصیت کیسے بھلائی جاسکتی ہے۔ میری دعا ہے کہ خداوند عالم مرحوم کو جوار معصومینؑ عنایت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کرامت فرمائے اور اس کے علاوہ میں اپنے لئے کیا کہہ سکتا ہوں کہ وہ تو چلے گئے اور میرے جانے میں بھی دیر نہیں ہے بس انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رضاً بقضائہ وتسلیماً لامرہ۔

مولانا کی آخری تحریر

۷۸۶

عزیز محترم مولانا جعفر صاحب دام [illegible]

سلام مسنون امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا [illegible] آپ کی طبیعت ناساز [illegible]
کہ آپ کو اللہ تعالیٰ [illegible] اب [illegible] آپ کی خدمت میں [illegible] مجھے افسوس [illegible]
[illegible]
[illegible] امیرالمومنین کی [illegible]
[illegible] آپ کو زحمت ضرور ہوگی مگر آپ ایسے [illegible] زحمت برداشت
کرنے کے عادی ہیں میں بہت زیادہ شکر گزار ہوں گا [illegible] کام
[illegible] والسلام

آپ کا دوست
عنایت حسین جلالوی

مکتوب بنام مولانا
مرزا محمد جعفر صاحب قبلہ
۴ اکتوبر سنہ ۹۴

یادگار کارنامہ

سید محمد تقی امروہوی
صدر عالمی فلسفہ کانگریس

یہ اطلاع ایک بہت بڑے حلقے میں انتہائی غم اور صدمے کے ساتھ سنی گئی کہ حضرت مولانا عنایت حسین جلالوی رحلت فرما گئے اور یوں ایک ایسا خلا پیدا کر گئے جس کا پر کرنا اب ممکن نظر نہیں آتا۔ مجلس ملی کا قیام قومی اور سماجی خدمت کے سلسلے میں ان کا یادگار کارنامہ ہے جس کی سرپرستی میں علمی اجتماعات منعقد ہوتے تھے جو ذہنی بالیدگی کے سلسلے میں بے حد مفید ثابت ہوئے ۔ بلکہ یوں کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ مجلس ملی کا وہ واحد پلیٹ فارم اس شہر میں تھا جس میں چند انتہائی فکر خیز اجتماعات منعقد ہوئے جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے ۔

آج جب کہ مولانائے محترم ہم میں نہیں تو ان سے ہماری محبت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ ہم ان کی اس یادگار کو زندہ رکھیں اور ان دوسری خدمات کو بھی جاری رکھنے کی سبیل کریں جو ان کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ہو رہی تھیں، امید ہے ہمارا معاشرہ اس قرض کو ادا کرے گا جو علمی سرمائے کی صورت میں اس معاشرے پر مولانا کا ہے ۔

آہ برادر من مولوی سید عنایت حسین جلالوی مرحوم

ممتازالافاضل مولانا حکیم سید باقر حسنین

اس دور منافقین میں بے ضرر ، مفید اور مخلص دوست ایک بہت بڑی نعمت ہے یہ اپنی بد قسمتی ہے کہ ہم اس عظیم نعمت سے محروم ہوگئے ۔ انتقال سے ایک ہفتہ قبل بوتراب جامع مسجد میں آخری ملاقات ہوئی مرحوم اپنی صنف میں مخلص ، ہمدرد ، صائب الرائے تھے جب کہ اس دور جدید میں یہ صنف حسد کبر و غرور اور نمائشی ہمدردیوں سے بھری ہوئی ہے ۔ برادر عزیز مولوی عنایت حسین صاحب جلالوی سے ۱۹۳۹ء سے میری ملاقات تھی ۔ منصبیہ عربی کالج میں مرحوم کے برادر بزرگ ۱۹۳۹ء میں میرٹھ ان کو لے کر آئے اتنے طویل عرصہ میں ہر قسم کے حالات سے مرحوم نے مقابلہ کیا۔ باپ ، بھائی ابتدائے عمر میں گزر گئے اپنی لاوارثانہ زندگی میں اپنا ایک مقام بنایا ہر دور ابتلاء سے گزرے لیکن تدین ، شرافت اور حدود شرعی سے باہر قدم نہ رکھا یہی مرحلہ انسان کے لئے سخت ترین امتحان ثابت ہوتا ہے ۔ مرحوم دور قدیم جو جدید سے قریب ہے اس کا ملا جلا نمونہ تھے ۔ جس سے دوستی ہوگئی اس کو نبھایا جس سے مخالفت ہوگئی اس کو کبھی نقصان نہ پہنچایا ۔ مخالفت کے باوجود مرحوم سے ایسا عمل ظاہر ہوا کہ مخالف خود حیران رہ گیا ۔ یہی شرافت نسلی کی دلیل ہے ، مرحوم نے ناظمیہ عربی کالج لکھنو ۔ منصبیہ عربی کالج (میرٹھ) جوادیہ کالج (بنارس) میں بزرگ اور قابل اساتذہ سے تعلیم دین حاصل کی ۔ لکھنو یونیورسٹی سے بھی فاضل ادب کا امتحان دیا ۔ مرحوم کی زندگی میں حالات کے نشیب وفراز نے مالی ، اقتصادی پریشانیوں میں کافی اضافہ کیا مگر باغیرت شخصیت نے کسب حلال کے ساتھ

صبر وشکر باری کیا۔ یہی مومن کی شان ہے کراچی کی زندگی میں، حسینی اسکول اور پریمیر کالج میں ایک عرصہ درس وتدریس میں صرف کیا اور اپنا ایک وقار قائم کیا۔ جامعہ امامیہ کی انتظامیہ کے لئے مفید مشورہ دینے کی اہلیت ثابت کی۔ آخری خدمت مجلس ملی کا قیام عمل میں لائے۔ غرضیکہ جب تک صحت نے ساتھ دیا اپنی صلاحیت علمی ومذہبی سے باہوش طبقہ کی اصلاح کرتے رہے۔ بوتراب جامع مسجد میں عرصہ ہوا مرحوم انتظامیہ کے سربراہ مقرر ہوئے مگر یہ اس شریف النسل سید کی ایمانی شان ہے کہ جب یہ محسوس کیا کہ ادارہ کی انتظامیہ سے اختلاف رائے ادارہ کے لئے مضر ہوگا تو خاموشی سے اپنا دامن بچاکر تعلق ختم کر دیا آج تک کسی کو معلوم ہی نہیں کہ مولوی عنایت حسین صاحب مرحوم نے بوتراب کی انتظامیہ سے کیوں علیحدگی اختیار کی۔

افسوس ہزار افسوس کہ ہم آج اپنے اس عزیز رفیق اور برادر و مخلص ساتھی سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے اب صرف دلی دعا یہی ہے کہ جس امام مظلومؑ کا ذکر زندگی بھر کرتے رہے اسی کی خدمت میں رسائی ہو اور روز قیامت ان کے لشکر میں شمولیت نصیب ہو۔ (آمین)

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ عباس کمیلی

یوں تو ملک بھر کے طول وعرض میں علمائے کرام خطبائے عظام اور دانشوروں کی کبھی قلت نہ رہی ہے اور نہ ہے مگر اس انجمن میں مولانا عنایت حسین جلالوی اعلی اللہ مقامہ جیسا پاکیزہ صفت ، پیکر خلوص ، جذبہ قومی سے سرشار ، سلمان صفت بوذر مزاج جرات رندانہ رکھنے والا مرد مومن عالم اور قلندر منش درویش اب کہاں ! مولانا عنایت حسین جلالوی ہمیشہ سب سے ممتاز منفرد اور یکتائے زمانہ رہے ہیں اور ان کا کوئی ثانی اور بدل پیدا ہو یہ ناممکن نہیں تو بہت ہی مشکل ضرور ہے ۔

اجتماعی سوچ ، درد ملی ، جذبہ قومی ، مسائل کا شعور اور ادراک ، جرات اظہار ، بے باک صداقت ، بے داغ کردار ، سیاسی بصیرت ، آنے والے خطرات کو قبل از وقت بھانپ لینے والا اور اسی کی فکر اور تدارک کی فکر میں مبتلا ، ذاتی اغراض ومفادات سے مبرا ، تنگدستی کے باوجود فاقہ مست ، دست سوال نہ پھیلانے والا شعلہ بیان خطیب ہم میں نہ رہا جس نے عالم اور خطیب ہوتے ہوئے کبھی اپنے آپ کو اپنی ذات کے خول میں بند نہ کیا اور نہ کبھی انانیت کا شکار ہوا۔ جس نے کبھی دولت اور شہرت کو اپنا مطمح نظر نہ بنایا ، جس نے حکام کے درباروں کا طواف نہ کیا اور نہ ہی ثروتمندوں کی چوکھٹوں پر جبہ سائی کی جو اپنے بارے میں نہ ہی احساس برتری میں مبتلا ہوا اور نہ ہی احساس کمتری کا شکار رہا جس نے سب کچھ نہیں تو بہت کچھ ہوتے

ہوئے اپنے آپ کو کبھی کچھ بھی نہ سمجھا اور اپنے آپ کو عالم اور خطیب ہوتے ہوئے قومی کارکنوں کی صف میں ہمیشہ شامل رکھا اور ہر قومی تحریک میں کسی عہدہ منصب اور نام و نمود کی پروا کئے بغیر فقط قومی خدمت کے جذبے کے تحت شریک رہا۔ جس سے جب کبھی ملاقات ہوئی تو گفتگو کا محور قومی اور اجتماعی مسائل ہی رہے۔ جو گلہ کرتا تھا تو قومی انتشار کا شکوہ کرتا تھا تو قوم کی بے حسی کا، جس نے اپنے گرد حلقہ بنا لیا تھا اور محفل سجا لی تھی تو اپنے ہی جیسے اور اپنے ہم مزاج مخلص کارکنوں کی جس کا منہ بولتا ہوا ثبوت "مجلس ملی" ہے۔ یہ ایک چراغ بجھتے بجھتے کتنے چراغ روشن کر گیا وہ محمود الحسن رضوی ہوں یا پروفیسر عباس وہ کاظم حسین نقوی ہوں یا سبط جعفر یا پھر ڈاکٹر ندیم۔ آہ! ڈاکٹر ندیم، ڈاکٹر ندیم جنہیں ہر طرف نظریں ڈھونڈتی ہیں۔ ڈاکٹر ندیم جواب اپنی محفل مولانا عنایت حسین کے ہمراہ وہاں سجا رہے ہوں گے۔ خدا ان چراغوں کو تا دیر روشن رکھے اور ان چراغوں سے ہر روز نئے چراغ روشن کرے تا کہ یہ محفل یہاں بھی کبھی سونی نہ ہو اور خدا مرحوم کے پس ماندگان کو بھی صبر جمیل کے ساتھ ساتھ مرحوم کے مشن کو جاری رکھنے کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)

مصلح اور مبلغ

ڈاکٹر میر محمد علی
سابق ڈائریکٹر بورڈ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن

اگر تدریسی مہارت ، معارفِ اسلامیہ اور شرافت نفس کسی انسانی پیکر میں ایک ساتھ جمع ہوجائیں تو میرے ذہن میں پروفیسر عنایت حسین جلالوی کا تصور ابھرتا ہے ۔ مولانا مرحوم کے بے شمار شاگرد ہیں ۔ مجلس حسینؑ بھی چونکہ ایک درسگاہ ہے اس نسبت سے مجھے بھی مولانا کے درس سے فیضیاب ہونے کا موقعہ ملا ہے ۔ بیان سلیس لیکن پر معنیٰ اور مجلس کے مقصد کے مطابق یعنی اصلاحِ ملت اور ابلاغ پیغام محمدؐ وآلؐ محمدؐ اصلاح ملت کے حوالہ سے مجلس ملی کا بھی خیال آگیا۔ ابھی ڈاکٹر ندیم شہید کا سانحہ تازہ ہی تھا کہ اس اہم ادارہ کا ایک اور ستون منہدم ہوگیا۔ خدا ان دونوں صاحبان علم ودانش کی مغفرت کرے۔

انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کے بعد اس کی باقیات میں تسلسل رہے۔ اس لحاظ سے مولانا عنایت حسین مرحوم خوش قسمت ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی سلمان میاں سلمہ کو ان کی ذمہ داریوں کے لئے تیار کردیا۔ مجھے خود بھی سلمان کی مجلس سننے کا اتفاق ہوا ہے ۔ خدا ان کے علم وآگہی میں مزید اضافہ کرے اور زبان میں اور تاثیر دے۔ مجھے یقین ہے کہ جنت الفردوس میں مولانا مطمئن ہیں کہ انکے منبر کی میراث کو سنبھالنے والا موجود ہے ۔ خدا ہم سب کو ان اعلیٰ اصولوں پر چلنے کی توفیق عطا کرے جن پر مولانا مرحوم گامزن تھے۔ (آمین)

ایک درویش صفت انسان

خطیب اہلبیتؑ نثار احمد قلندری

میرے لئے یہ امر باعث افتخار ہے کہ برادرم سلمان جلالوی فرزند قبلہ مولانا عنایت حسین جلالوی مرحومؒ کے حکم کی تعمیل میں اپنے استاد محترم قبلہ مولانا عنایت حسین جلالوی مرحوم کی خدمت میں خراجِ عقیدت کے طور پر چند سطور تحریر کر رہا ہوں ۔

قبلہ مولانا صاحب سے میرا طالبعلمی کا رشتہ ہے اور یہ آپ کی شفقت کا نتیجہ ہے کہ میرا نام بھی ادنیٰ مدح خوانِ اہلبیت علیہم السلام میں شامل ہے آپ نے مجھے جامعہ امامیہ میں درس دیا اور مجلس ملی کی ماہانہ نشستوں میں تقریر کا موقع عنایت کرکے عملی تربیت دی ۔

قبلہ مولانا صاحبؒ ایک شفیق ، ملنسار اور درویش صفت انسان تھے آپ کی سادگی آپ کا خاص جوہر تھا ۔ کوئی بناوٹ تصنع آپ کے قریب سے بھی نہیں گذری ۔ ہر ایک کے ہمدرد ، مشکل میں کام آنے والے اور حوصلہ دینے والے بزرگ تھے ۔ آپ ایک باعمل صاحب تقویٰ اور مخلص عالم تھے یہی وجہ ہے کہ آپ ہر ایک کے دل میں جگہ پانے والے تھے ۔ مجھ پر آپ کے بڑے احسان ہیں میرا حوصلہ بڑھایا اور شفقت پدری دی ۔

ملی امور میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں جن کا جناب محمود الحسن رضوی نے تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔

آج قبلہ مولانا صاحبؒ ظاہری طور پر ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن آپ کی دینی خدمات ، اخلاص ، سادگی اور درویشی ہمیشہ آپ کی موجودگی کا احساس دلاتی رہے گی ۔

آخر میں قبلہ مولانا مرحوم کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہوں کہ پروردگار آپ کے درجات بلند کرکے آپ کو جوار معصومین علیہم السلام میں خاص قربت عطا فرمائے اور آپ کی بزرگی اور دعاؤں کو ہماری بخشش کا وسیلہ قرار دے۔

ایک عالم باعمل

حاج سید ضمیر اختر نقوی

مولانا عنایت حسین جلالوی اعلیٰ اللہ مقامہ، ایک عالم باعمل، قوم وملت کے دانشور اور ماہر تعلیمات تھے انہوں نے عزت کی زندگی گزاری اور عزت کی موت بھی پائی۔ تشنگان علم کی پیاس بجھائی اور طالبان علم میں علم کے خزانے لٹائے۔ فلاحی کام میں آگے آگے ہوتے تھے، "مجلس ملی" کے روح رواں تھے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی پر نہایت شاندار اور یادگار سمینار کا اہتمام کیا تھا۔ علمی کتابیں چھپوانے کا اہتمام فرماتے تھے۔

اپنی مصروف زندگی میں "ذکر حسینؑ" سے کبھی غافل نہیں تھے، یادگار مجلسیں پڑھیں اور کالجوں اور اسکولوں کے "یوم حسینؑ" میں ہمیشہ سید الشہداءؑ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے تشریف لاتے تھے۔ اب انشاء اللہ سلمان میاں ان کے مشن کو آگے بڑھائیں گے۔ جنت فردوس میں اللہ ان کے مرتبوں کو بلند فرمائے۔ (آمین)

جید عالم دین

پروفیسر اعجاز حسین تارڑ
سراج الدولہ گورنمنٹ کالج کراچی

مولانا پروفیسر سید عنایت حسین جلالوی اعلیٰ اللہ مقامہ جید عالم دین عظیم استاد اور عمدہ خطیب تھے ۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی درس وتدریس اور تبلیغ دین کے لئے وقف کر رکھی تھی ۔ قوم کے لئے درد مند دل رکھتے تھے ۔ ہمیشہ ملی مسائل کے حل کے لئے کوشاں رہے ۔ اپنے جد امیر المومنین علیہ السلام کے فرمان کے مطابق مال دنیا سے دور رہے ۔ مولانا مرحوم کی حلت ملت کے لئے بڑا نقصان ہے ۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار آئمہ اطہار علیہم السلام میں جگہ عطا فرمائے در ان کے درجات بلند فرمائے ۔ ان کی اولاد اور احباب کو صبر جمیل عطا فرمائے ۔ (آمین)

پروفیسر غلام نبی پٹھان
سراج الدولہ گورنمنٹ کالج

پروفیسر سید عنایت حسین جلالوی بزرگ استاد تھے ۔ آپ نے تعلیمی میدان میں گرانقدر خدمات انجام دیں ۔ اساتذہ میں بلند مقام رکھتے تھے اللہ تعالیٰ آپ کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے ۔

پروفیسر علی محمد جاوید
وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی

مولانا سید عنایت حسین جلالوی اعلیٰ اللہ مقامہ ایک عظیم اور جید

عالم دین تھے جنہوں نے اپنی زندگی دین کے لئے صرف کر دی ۔ ان کا انتقال ملت کے لئے بڑا نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے ۔

مرنجان مرنج ہستی

پروفیسر محمد جمیل اجمل گورنمنٹ دھلی کالج

آہ ! ہمارے پیارے ساتھی عنایت حسین جلالوی مرحوم و مغفور آپ ملنسار ، بردبار اور متقی تھے ، دوستوں کے دوست ، مرنجان مرنج ہستی تھے ۔ کسی کی دل آزاری برداشت نہیں کرتے تھے اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے۔

"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ۔"

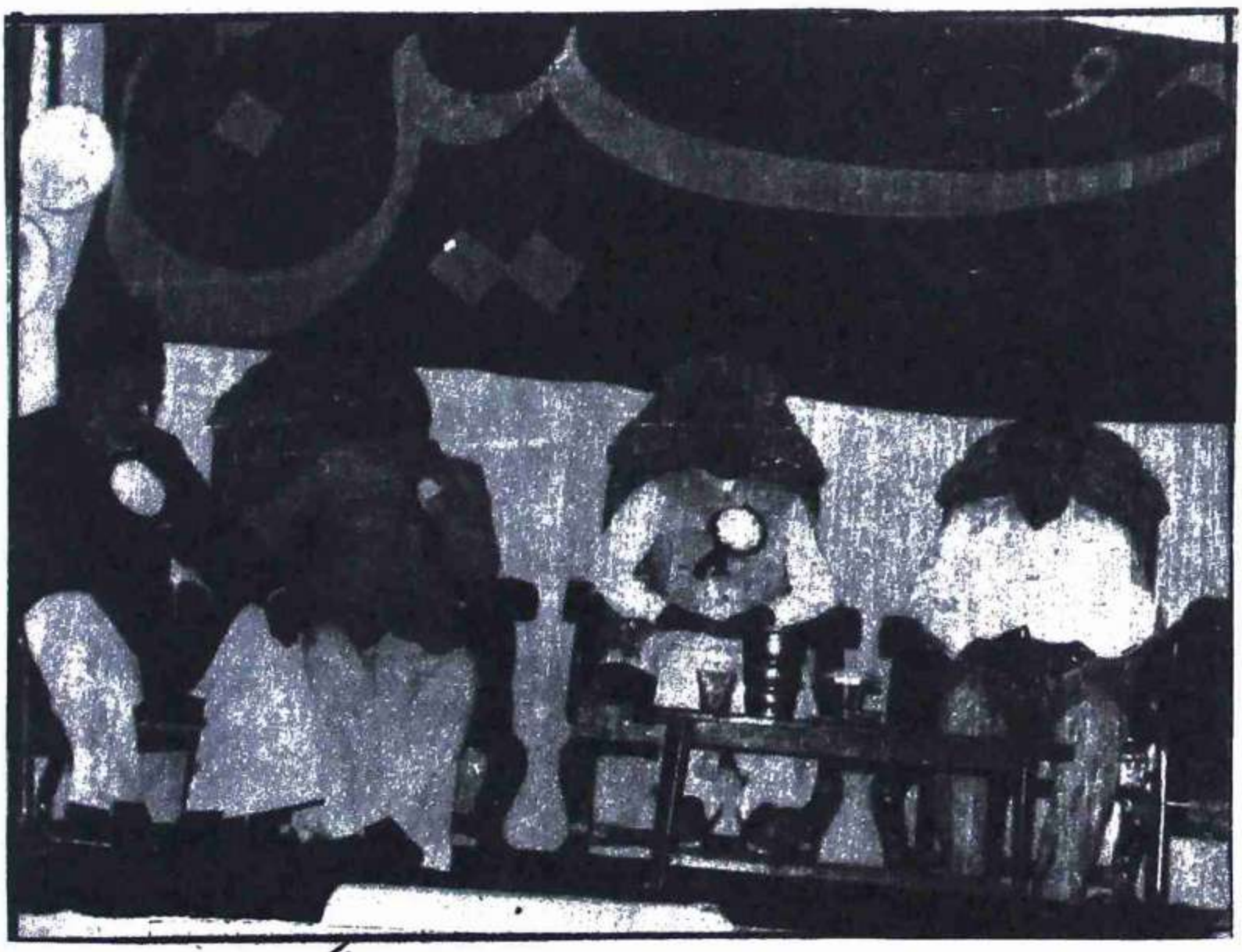

کرسی صدارت پر مہمان خصوصی زہیر اکرم ندیم اور دیگر کے ہمراہ

مرد خود آگاہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن رضوی

محترم مکرم حضرت مولانا سید عنایت حسین جلالویؒ میرے بزرگ تھے میں نے ہمیشہ ان کو قومی خدمات کے سلسلہ میں سرگرم عمل دیکھا ۔ میرے والد بزرگوارؒ ان سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے ۔ علمی خدمات بھی انجام دیں ، مدرسۂ جامعہ امامیہ کے صدر تھے ، مجلس ملی کے بانی تھے ، غرض بے شمار خدمات اور فضائل کے حامل تھے ، ذاکر تھے ، قومی رہنما تھے ۔ صاحب کردار بزرگ تھے ، بے لوث خدمات انجام دینے والے تھے ، دین کو دنیا بنانے اور کمانے کا ذریعہ نہ بنانے والے ، ذکر حسینؑ کی تجارت نہ کرنے والے انسان تھے ۔ جو قول تھا وہی عمل تھا ، کسی کی خوشامد یا تعریف سننے کے حریص نہ تھے ۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ

یہ تمام ایسی عظیم خصوصیات ہیں کہ ان میں سے ایک بھی کسی کو نصیب ہوجائے تو وہ بڑا خوش نصیب اور قابل تعریف انسان سمجھا جائے گا ۔ ان تمام فضائل کے باوجود بلا کے منکسر المزاج اور شرافت اور انسانیت کا پیکر تھے ۔ ساری عمر تدریس میں صرف کی وہ بھی دینی علوم کی تدریس میں ۔ یہ وہی کام ہے جو انبیاءؑ اور ائمہؑ انجام دیتے رہے ہیں ۔ خدا کرے کہ انہیں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ رہیں ۔ صحیح معنی میں " مرد خود آگاہ وخدا ہست " تھے ۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ناقابل فراموش یادیں

سید شرف الحسن زیدی ۔ اسلام آباد

۱۱ ، اکتوبر ۱۹۹۴ء کو میں ایک شادی کے سلسلے میں کراچی پہنچا اور اسی وقت میرے بیٹے سید شمس الحسن زیدی نے یہ منحوس اور جانکاہ خبر سنائی کہ پرسوں مولانا سید عنایت حسین جلالوی صاحب قبلہ رحلت فرما گئے ہیں اور کل ان کی فاتحہ سوئم بھی ہو چکی ہے ۔ یہ سنتے ہیں میرے ہوش وحواس گم ہوگئے اور میں نے ایک لمحہ کے لئے یہ محسوس کیا جیسے کسی نے میرے دل کو مروڑ کر اس کی حرکت بند کردی ہے۔ میں تو ان سے ملاقات کی امید لیکر آیا تھا ۔ اس سے پہلے میں جب کبھی کراچی آتا تھا یا مولانا صاحب راولپنڈی تشریف لاتے تھے تو ہماری ملاقات ضرور ہوتی تھی بلکہ یہ مجھ پر مولانا کا بہت بڑا کرم تھا کہ جب وہ راولپنڈی تشریف لاتے تھے تو میرے پاس ہی قیام فرمایا کرتے تھے۔ بخدا مجھے اب تک یقین نہیں آتا کے مولانا قبلہ اب اس دنیا میں موجود نہیں اور ہماری پچاس سال کی رفاقت ختم ہو چکی ہے حالانکہ میں ان کے در دولت پر حاضر ہو کر ان کے بچوں سے تعزیت بھی کر آیا ہوں اور فاتحہ بھی پڑھ آیا ہوں ۔ ان کے ڈرائنگ روم میں آویزاں بڑے سائز کی تصویر میں ان کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر اب بھی مجھے یہی خیال آتا ہے کہ مولانا ابھی زندہ ہیں اور ابھی آکر مجھ سے بغلگیر ہو جائیں گے ۔ مرحوم سے میری آخری ملاقات نومبر ۱۹۹۲ء میں اس وقت ہوئی تھی جب میں اپنی اہلیہ کو علاج کیلئے کراچی لایا تھا۔ مرحومہ کی وفات پر مولانا صاحب قبلہ کا تعزیت نامہ مجھے ملا تھا لیکن میں معذور ومجبور ہوجانے کی وجہ سے نہ تو ان کو شکریہ کا خط لکھ سکا تھا اور نہ اب تک کراچی آسکا تھا۔

۲۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۳ء وہیں نئی دہلی کے سکرٹریٹ نارتھ بلاک میں ہوئی تھی ۔ میں اس وقت ڈائرکٹر جنرل انڈین میڈیکل سروس کے دفتر میں ملازم تھا ان سے نئی نئی دوستی ہوئی تھی اور تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی تھی ۔ مولانا صاحب معلوم نہیں کس سلسلے میں نئی دہلی تشریف لائے تھے۔ اسی دوران ان سے میری ملاقات ہوئی تھی ۔ غالباً مولانا نے نئی دہلی میں تین چار دن قیام کیا تھا اور اس کے بعد تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی رہی ۔ اس کے بعد میرا تبادلہ دہلی سے شملہ ہوگیا اور قیام پاکستان تک وہیں رہا جس کی وجہ سے ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہوسکی تھی ۔ مولانا صاحب غالباً ۱۹۴۷ء کے آخر یا ۱۹۴۸ء کے آغاز میں کراچی تشریف لائے اور جیکب لائن میں کسی عزیز کے ساتھ ایک کوارٹر میں رہائش پذیر ہوئے ۔ مجھے اگرچہ جٹ لائن میں کوارٹر ملا تھا لیکن میں ہر روز دفتر سے چھٹی کرکے جیکب لائن سے گزر کر ہی گھر واپس جایا کرتا تھا ۔ ایک دن مولانا صاحب سے اچانک جیکب لائن میں ملاقات ہوگئی ۔ ہم دونوں بڑے جوش مسرت کے ساتھ بغلگیر ہوئے اور پھر ملاقات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان ہی دنوں حکومت پاکستان نے دستور ساز اسمبلی کے دفتر میں آئین سازی کے سلسلے میں مشورہ دینے کے لئے "تعلیمات اسلامی بورڈ" کے نام سے ایک نیا دفتر قائم کیا۔ اس بورڈ کے ممبران میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ظفر احمد انصاری جیسے جید سنی علماء کے ساتھ مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ کو بھی شیعہ عالم کی حیثیت سے شریک کیا گیا۔ مفتی صاحب قبلہ کو بھی رہائش کیلئے ایک ایف ٹائپ کوارٹر الاٹ ہوا جس میں انہوں نے اپنے اہل خانہ کے ساتھ قیام فرمایا ۔ مولانا عنایت حسین صاحب کے مفتی صاحب قبلہ کے ساتھ پہلے سے گہرے روابط بلکہ بے تکلف دوستی

تھی اسی دوران مولانا کو بھی کو تعلیمات اسلامی بورڈ کے دفتر میں ایک ملازمت مل گئی ۔ اب تو مولانا صاحب کی مفتی صاحب کے ساتھ دفتر میں بھی اور گھر پر بھی ملاقات رہنے لگی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ سایہ کی طرح رہنے لگے۔

۳ ۔ مولانا سید عنایت حسین جلالوی صاحب ایک فاضل عالم دین تھے انہوں نے دینی تعلیم مدرسہ منصبیہ میرٹھ اور مدرسہ ناظمیہ لکھنو سے حاصل کی تھی ۔ نہایت شگفتہ مزاج اور خوش بیان مقرر تھے۔ زہد وتقویٰ ان کا شعار تھا ۔ اردو ، فارسی اور عربی زبان وادب پر انہیں عبور حاصل تھا۔ زبان و قلم دونوں پر انہیں دسترس حاصل تھی ۔ بیباکی کا یہ عالم تھا کہ تحریر وتقریر میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہونا وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ خوش اخلاق اس قدر کہ جس سے ایک بار ملاقات ہو گئی تو پھر عمر بھر اس سے دوستی نبلہتے تھے۔ ان اوصاف کے باوجود انہوں نے خود کو پیشہ ور مولوی یا مقرر نہیں بنایا ۔ اگر وہ عمامہ اور قبا پہن کر نماز پڑھانے اور نذرانے طے کرکے مجالس عزاء پڑھنے والے مولوی بن جاتے تو یقیناً وہ شہرت اور مالی منفعت کی بلند چوٹی پر پہنچ گئے ہوتے لیکن یہ بات ان کے مزاج کے خلاف تھی ۔ وہ ہمیشہ شیروانی ، قمیص اور لکھنو فیشن کے چوڑے پائنچے کے پاجاموں اور سیاہ رام پوری ٹوپی میں ملبوس رہے۔ مجالس عزا میں ان کی تقاریر بڑی عالمانہ اور پراثر ہوتی تھیں لیکن انہوں نے کبھی مجالس کو اپنا مستقل ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ ایام عزاء میں ان کے معتقدین نے مجالس پڑھنے کیلئے کراچی سے بلالیتے تھے تو انکار نہیں کرتے تھے۔ ناچیز کی درخواست پر ایک بار موصوف نے اسلام آباد میں عشرہ محرم کی مجالس پڑھیں وہاں بلاشبہ پڑھے لکھے اور نکتہ فہم سامعین کا مجمع کثیر ہوتا تھا سب لوگوں نے ان

کے فن خطابت اور اسلوب بیان کی بے حد تعریف وستائش کی تھی ۔

۴ ۔ کلام وبیان کی بے باکی کے سلسلے میں اس واقعہ کو سپرد قلم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ قیام پاکستان کے تھوڑے ہی دنوں بعد جب لاہور میں شیعیان پاکستان کا ایک عظیم الشان اجتماع منعقد ہوا جس میں اس امر پر غور کیا گیا کہ قیام پاکستان کے بعد شیعوں کے حقوق کے تحفظ کیلئے کیا کسی تحریک یا ادارہ کی ضرورت ہے یا شیعہ من حیث القوم خاموش اور مطمئن ہو کر بیٹھے رہیں۔ اس اجتماع میں پاکستان بھر کے نامور عمائدین ، معززین و قائدین شریک ہوئے جن میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں :۔

نواب مظفر علی قزلباش صاحب ، کرنل عابد حسین صاحب ، نواب احسان علی خاں صاحب آف مالیر کوٹلہ ، پیر نوبہار شاہ آف خانیوال ، غلام عباس شاہ صاحب ، میجر مبارک علی شاہ صاحب ، سید ہادی علی شاہ صاحب ، سید مظفر علی شمسی صاحب ، شائق انبالوی صاحب ، مفتی جعفر حسین صاحب ، حافظ کفایت حسین صاحب ، مولانا اظہر حسن زیدی صاحب ، مولانا محمد بشیر انصاری صاحب فاتح ٹیکسلا ، میر باقر حسین جعفری صاحب ، محبوب علی شاہ صاحب ، شیخ محمد صدیق صاحب ایڈیٹر رضاکار لاہور ملک صادق علی عرفانی صاحب ایڈیٹر اخبار شیعہ لاہور ۔

اس اجلاس میں شیعہ کانفرنس کے عمائدین نواب مظفر علی قزلباش ، مولانا محمد بشیر انصاری صاحب اور شائق انبالوی کا خیال تھا کہ فی الحال شیعوں کو خاموش رہنا چاہیئے ۔ اگر ضرورت پڑی تو شیعہ کانفرنس شیعوں کے حقوق کے حصول اور تحفظ کیلئے مناسب اقدامات کرے گی ۔ سرے عمائدین کا نقطۂ نظر تھا کہ ابھی سے تحفظ حقوقِ شیعہ کیلئے ایک علیحدہ ادارہ

قائم کیا جائے اور قوم کو حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے منظم کیا جائے ۔ جب بحث طویل ہو گئی تو مولانا عنایت حسین صاحب نے مائکروفون سنبھالا اور ایک پرجوش تقریر میں شیعہ کانفرنس کے عمائدین کو خوب سنائیں اور اس امر پر زور دیا کہ ایک علیحدہ ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کیلئے قائم کیا جائے ۔ چنانچہ اسی وقت اس تجویز پر عمل شروع ہو گیا اور مولانا موصوف کے تجویز کردہ نام سے " ادارہ عالیہ تحفظِ حقوقِ شیعہ " قائم ہو گیا۔ دوسرے ہی روز مولانا نے اس ادارہ کا دستور العمل بھی تیار کر کے دیدیا اور اس طرح پاکستان کے گوشے گوشے میں اس ادارہ کی شاخیں قائم کرنے کا کام شروع ہو گیا۔ میں نے یہ واقعہ میر باقر حسین جعفری صاحب سے سنا تھا اور اس کی تصدیق سید مظفر علی شمسی صاحب ، شیخ محمد صدیق صاحب ایڈیٹر رضاکار اور مفتی جعفر حسین صاحب نے فرمائی تھی ۔ مولانا عنایت حسین صاحب ان سب اکابرین ملت سے فرداً فرداً تو آشنا تھے ہی لیکن اس موقع کے بعد یہ سب لوگ مولانا کی بہت عزت و تکریم کرنے لگے تھے بالخصوص جناب نواب احسان علی خاں صاحب آف مالیر کوٹلہ اور ان کے فرزند حسین علی خاں صاحب تو مولانا کے گرویدہ ہو گئے ۔

۵ ۔ ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ کی تشکیل کا ذکر کرنے کے بعد اس امر کا تذکرہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ادارہ کی شاخیں ملک بھر میں قائم کرنے اور انہیں فعال بنانے کیلئے مولانا جلالوی صاحب مظفر علی شمسی صاحب ، میر باقر حسین جعفری صاحب ، شیخ محمد صدیق صاحب ایڈیٹر رضاکار نواب احسان علی خاں صاحب اور سید اسرار حسین صاحب ایڈوکیٹ نے قومی ورکروں کے تعاون سے دن رات بڑی محنت کے ساتھ کام کیا ۔ اکثر وبیشتر سید مظفر علی شمسی صاحب ، میر باقر حسین صاحب جعفری اور شیخ محمد

صدیق صاحب کے ساتھ اپنے ذاتی اور قومی معاملات کے سلسلے میں وزراء اور افسران سے ملنے کیلئے کراچی تشریف لایا کرتے تھے۔ یہ لوگ عموماً نگار ہوٹل میں ٹھہرتے تھے اور جب تک کراچی میں رہتے تھے مولانا جلالوی صاحب ، محمود الحسن رضوی صاحب ، مظہر عباس زیدی صاحب ، توکل حسین عابدی صاحب ، علی اوسط زیدی صاحب ، صفدر حسین زیدی صاحب ، انوار حسین جعفری صاحب ، سید علی عرف پتن صاحب اور ناچیزان کے پاس موجود رہتے اور رات گئے تک محفل جمی رہتی تھی ۔ ۱۹۵۶ء میں سید مظفر علی شمسی صاحب نے ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ کا سالانہ اجلاس بڑے پیمانے پر باغ بیرون موچی دروازہ لاہور میں منعقد کرنے کا پروگرام بنایا اور اس میں شرکت کیلئے کراچی کے تمام ورکروں اور علامہ رشید ترابی صاحب قبلہ کو جو اس وقت کراچی ادارہ کے صدر تھے مدعو کرنے کیلئے شمسی صاحب خود کراچی تشریف لائے اور سب پر زور دیا کہ اس اجلاس میں سب کے سب شرکت کریں ۔ چنانچہ کراچی سے علامہ رشید ترابی صاحب کے علاوہ مولانا عنایت حسین صاحب ، انوار حسین جعفری ، توکل حسین عابدی ، محمود الحسن رضوی ، علی اوسط زیدی ، مظہر عباس زیدی ، صفدر حسین زیدی اور ناچیز ایک نمائندہ گروپ کی شکل میں جب لاہور اسٹیشن پر پہنچے تو مقامی رضاکاروں نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا اور شمسی صاحب کے گھر پر ہمارے قیام و طعام کا بندوبست کیا ۔ جب ہم علامہ رشید ترابی صاحب کی قیادت میں جلسہ گاہ کے پنڈال میں داخل ہوئے تو پرجوش نعروں سے خیرمقدم کیا گیا۔ رات کو نواب احسان علی خاں صاحب نے باہر سے آنے والے تمام مندوبین کو کھانے پر اپنی کوٹھی واقع ماڈل ٹاون پر مدعو کیا اور سب مہمانوں کو کوٹھی تک لانے اور واپس پہنچانے کیلئے بس کا انتظام کیا ۔ بلاشبہ یہ ایک یادگار اور

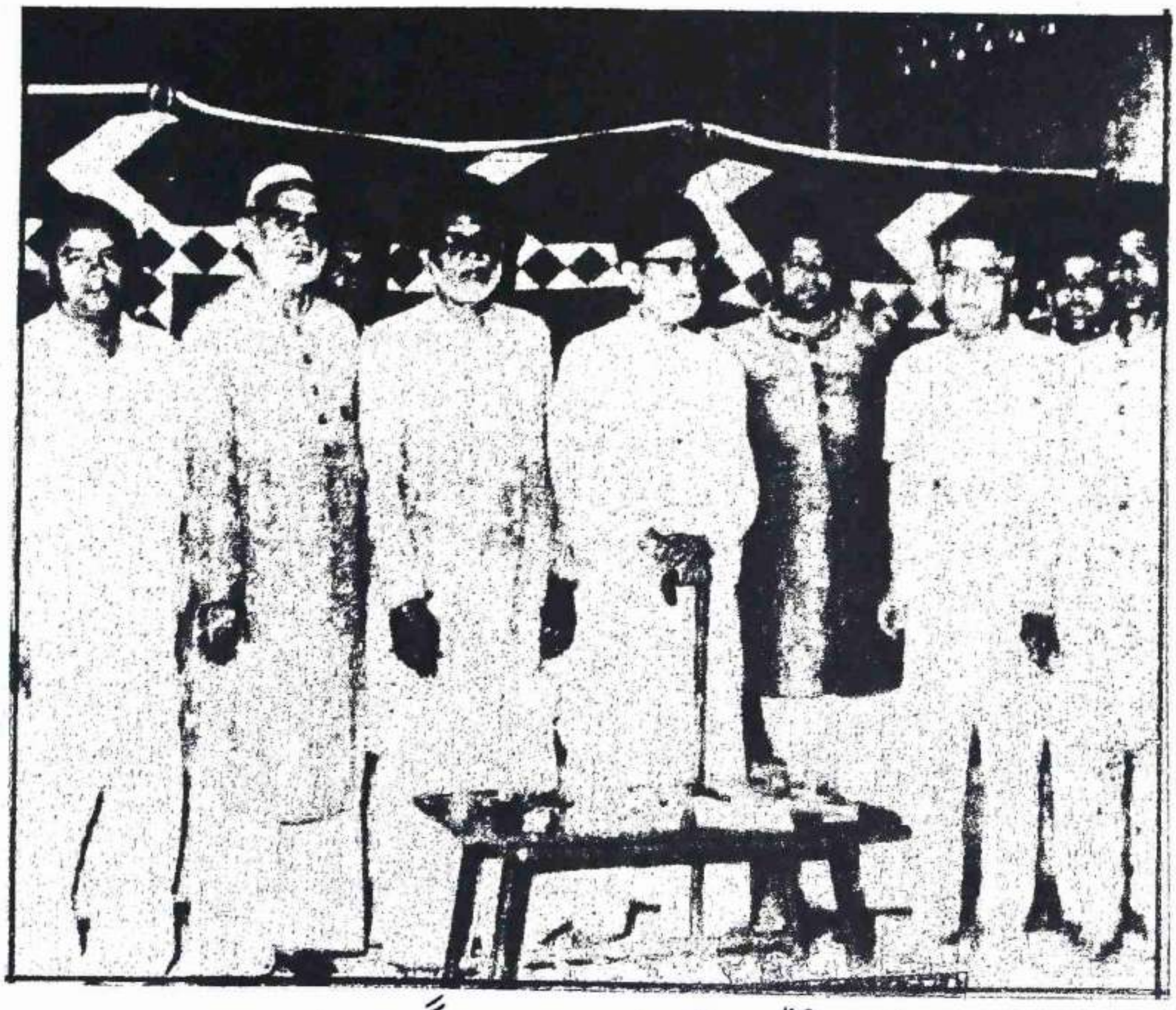

خطیب اعظم سید محمد دہلوی مرحوم اور دیگر زعماء کے ساتھ

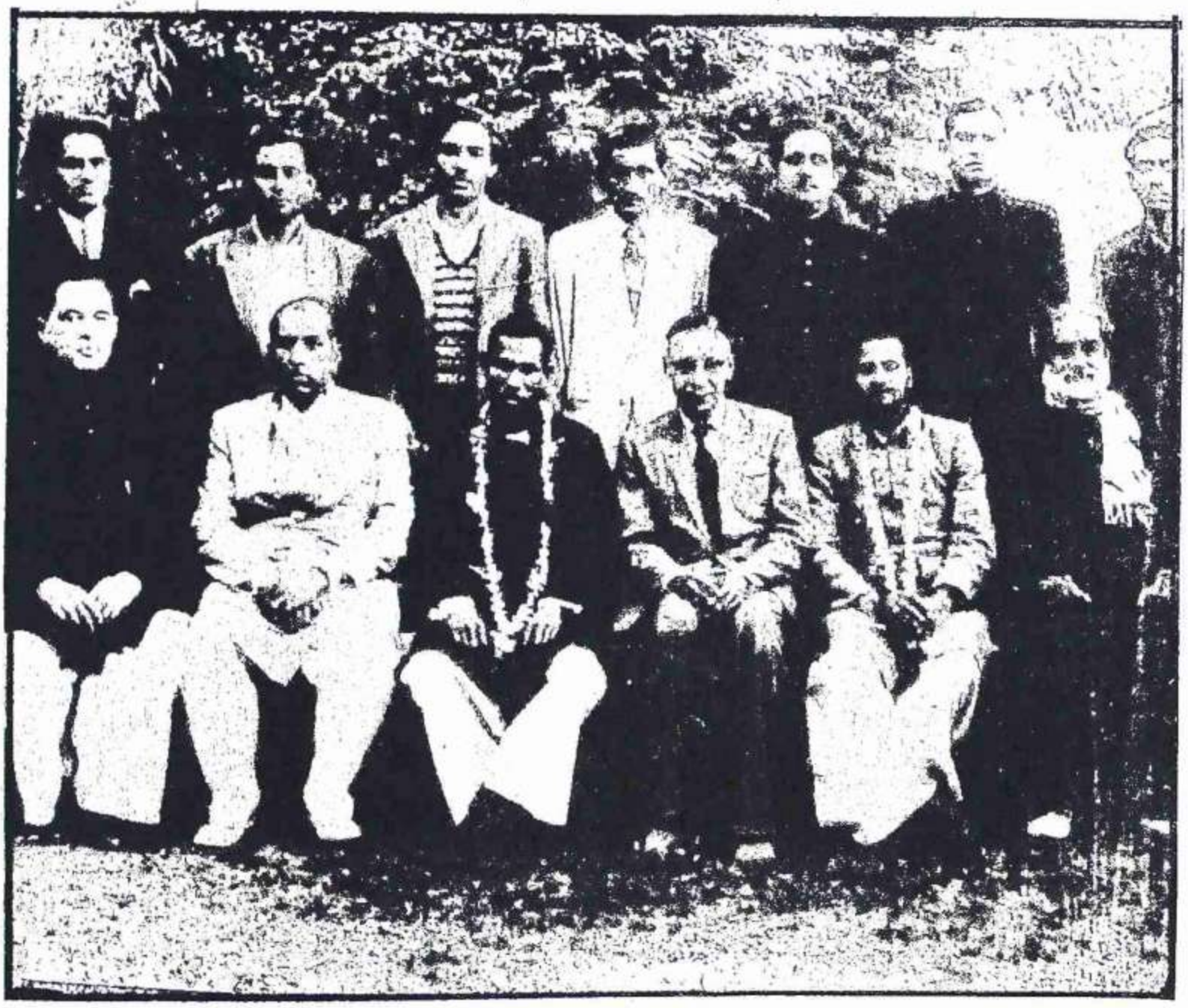

ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کی جانب سے بی ڈی ممبر منتخب ہونے کے بعد منعقدہ استقالیہ میں

پرتکلف دعوت تھی۔

۶ ۔ ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ کے قیام اور اس کی کاروائیوں میں مولانا جلالوی صاحب کی سرگرمیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد ہم مولانا کے دوسرے دینی مشاغل کا ذکر سپرد قلم کرنا چاہتے ہیں ۔ جٹ لینڈ لائن میں قیام پاکستان کے بعد ہی ۱۹۴۷ء میں ایک امام باڑہ اور مسجد قائم کردئے گئے تھے اس کی نگرانی ، مفادات ، عبادات ومجالس کے انتظامات کیلئے " انجمن سپاہ حسینی " قائم کی گئی ۔ خواجہ محمد مرتضیٰ صاحب اس کے صدر اور نواب حسین صاحب اس کے جنرل سکریٹری بنائے گئے ۔ مولانا عنایت حسین جلالوی صاحب اس کے غالباً جوائنٹ سکریٹری اور توکل حسین عابدی صاحب انتظامیہ کے ممبر بنے تھے ۔ کچھ عرصہ کے بعد اس امام باڑہ میں درگاہ پنجہ شریف دہلی کی قدیم سالانہ مجالس کے انداز پر بڑی سالانہ مجالس کا پروگرام بنایا گیا۔ ان مجالس میں خطاب کرنے کیلئے نامور علمائے کرام جناب حافظ کفایت حسین صاحب ، مولانا سید اظہر حسن زیدی ، مفتی جعفر حسین صاحب ، مولانا سید محمد دہلوی صاحب مولانا مرزا احمد علی صاحب اور علامہ رشید ترابی صاحب کو مدعو کیا گیا۔ تمام انتظامات اور مجالس کو کامیاب بنانے کی ذمہ داری مولانا عنایت حسین جلالوی پر ڈالی گئی انہوں نے ان مجالس میں اسٹیج سکریٹری کے فرائض انجام دیئے ان کی اور دیگر کارکنان کی محنت اور جدوجہد سے یہ پروگرام بہت کامیاب ہوا ، مجالس بہت مقبول ہوئیں اور یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا۔

۷ ۔ ۱۹۵۴ء میں خواجہ ناظم الدین صاحب کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں پاکستان کے دستور کی تیاری کا آغاز ہوا۔ جناب اے کے بروہی صاحب وزیر قانون نے دستور کا مسودہ تیار کرکے دستور ساز اسمبلی کو دیا۔ اس میں

تحریر تھا کہ پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت کے منافی نہیں بنایا جائے گا۔ اس سے شیعان پاکستان میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ تمام ملک سے صدائے اُحتجاج بلند ہوئی اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ دستور کے اس آرٹیکل کے ساتھ اس امر کی وضاحت کی جائے کہ "قرآن وسنت" کا مفہوم جو اسلام کے کسی ایک فرقہ کے نزدیک مسلمہ ہے وہ کسی دوسرے فرقہ پر لاگو نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر فرقے کے لئے وہی مفہوم لیا جائے گا جو اس فرقے کے نزدیک مسلمہ ہوگا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے رضویہ سوسائٹی کراچی کے وسیع میدان میں (جہاں اب آبادی ہوگئی ہے) ایک بہت بڑے کل پاکستان شیعہ کنونشن کا انتظام کیا گیا۔ ملک بھر کے اکابرینِ ملت کو اس میں شرکت کیلئے مدعو کیا گیا ۔ ایک بہت وسیع پنڈال میں بہت بڑا اسٹیج بنایا گیا جس پر جملہ اکابرین ، مفکرین ، علماء کرام اور قانون دان حضرات کو بٹھایا گیا۔ عام پبلک اور سامعین کے بیٹھنے کیلئے کرسیوں کا انتظام کیا گیا۔ کراچی کے تمام قومی ورکروں بالخصوص ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کے کارکنوں نے اس کے انتظامات میں بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ حصہ لیا ۔ شیعہ کانفرنس اور ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کے نمائندے پہلی بار اس قومی پلیٹ فارم پر ایک ساتھ بیٹھے اور کاروائی جلسہ کے دوران بھی ان میں ہم آہنگی پائی گئی ۔ علماء ومفکرین نے شیعی نقطہ نظر کی حمایت میں پر جوش تقاریر کیں ۔ قانون دان حضرات نے قانونی نکات پر بحث کی ۔ جلسہ کی صدارت جناب آغا سلطان میرزا صاحب ریٹائرڈ سیشن جج نے کی ۔ ایک صاحب بشیر حسین زیدی صاحب ایڈوکیٹ نے تجویز پیش کی کہ پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنایا جائے اور اس کے مطابق اس کا آئین بنایا جائے۔ جملہ حاضرین نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور محرک ناراض ہو کر جلسہ سے واک آوٹ کر گئے ۔ دوپہر

کیوقفہ کے دوران مفتی جعفر حسین صاحب مولانا عنایت حسین جلالوی صاحب اور سید اسرار حسین ایڈوکیٹ پر مشتمل سبجیکٹ کمیٹی نے ایک مسودہ قرار داد تیار کرکے دوسرے نشست میں پیش کیاجس کو متفقہ طور پر پاس کردیا گیا۔ اس قرار داد میں وہی مطالبہ کیا گیا تھا جس کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے ۔ اس اجلاس میں مولانا عنایت حسین صاحب بطور مقرر تو مائکروفون پر نہیں آئے لیکن ایک خاموش ورکر کی حیثیت سے اس اجلاس کو کامیاب بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ یہ ان کی کوششوں اور اثرورسوخ کا نتیجہ تھا جو یہ کانفرنس کامیابی سے ہمکنار ہوئی ورنہ شیعہ کانفرنس اور ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کے نمائندوں کی چپقلش کی نذر ہوجاتی ۔

۸ ۔ ۱۹۵۶ء میں چودھری محمد علی صاحب وزیر اعظم کے زمانہ میں آئین کا مسودہ دستور ساز اسمبلی سے پاس ہوگیا اور اس میں یہ آرٹیکل شامل تھا کہ پاکستان میں قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا اور قرآن وسنت کا مفہوم پرسنل لاء کی حد تک. کسی فرقے کیلئے وہی لیا جائے گا جو اس فرقے کے نزدیک مسلمہ ہوگا (یعنی ایک فرقہ کا مسلمہ مفہوم دوسرے فرقہ پر لاگو نہیں ہوگا) ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کے اجلاس منعقدہ لاہور جس کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے میں راقم احروف اور سید محمود الحسن رضوی صاحب نے سید جمیل حسین رضوی صاحب ایڈوکیٹ جو اس وقت ادارہ کے جنرل سکریٹری تھے پر زور دیا کہ اس آرٹیکل میں سے لفظ " پرسنل " کو حذف کرایا جائے اور اس تشریح کا اطلاق ہر پبلک لاء پر کیا جائے ۔ لیکن موصوف اس کے لئے راضی نہ ہوئے اور کہنے لگے ہمارا تو اختلاف ہی پرسنل لاء میں ہوتا ہے ۔ اس زمانے میں ہاتھ کاٹنے کی سزائیں نافذ کرنے کی کوئی بھی شخص جرأت نہیں کرسکتا ۔ آج دیکھئے تو تحریک فقہ جعفریہ کے اراکین کتنی قربانیاں دے رہے

ہیں ۔ کتنے مصائب اٹھا رہے ہیں ۔ اگر آئین میں لفظ " پرسنل " ہوتا تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا ۔ اس وقت یہ کام اتنا مشکل نہیں تھا۔

۹ ۔ کراچی میں شیعہ کنونشن کے حسن انتظام اور کامیابی سے متاثر ہو کر ادارہ عالیہ حقوق شیعہ کے ورکروں نے یہ سوچا کہ اس جذبہ خدمت ملی کو زندہ رکھنے کیلئے نوجوان ورکروں کی ایک علیحدہ تنظیم قائم کی جائے ۔ چنانچہ اس تجویز پر غور کرنے کیلئے جٹ لینڈ لائن کے امام باڑہ میں ورکروں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں یہ تجویز پاس ہو گئی ۔ مولانا عنایت حسین جلالوی صاحب نے اس تنظیم کا نام " مرکز شباب الشیعہ " تجویز کیا جو قبول کر لیا گیا۔ موصوف نے اس کا دستور العمل بھی تیار کر کے دیدیا ۔ اس تحریک کی سید علی عرف پتن صاحب نے سخت مخالفت کی اور اوپر کے حلقوں میں بھی بے چینی پیدا ہوئی ۔ ان کو خدشہ تھا کہ اس طرح ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کی بنیادیں کمزور ہو جائیں گی ۔ در حقیقت یہ کسی کا بھی منشاء نہیں تھا بلکہ سب نوجوان ادارہ کی ضروریات کے پیش نظر ہی خود کو منظم کر رہے تھے ۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد کچھ ورکروں نے کراچی میں ادارہ کی تنظیم نو کرنے اور جمہوری اصولوں پر اس کے انتخاب کرانے کی مہم شروع کر دی ۔ پہلے ممبر سازی کی گئی اس کے بعد جناب باقر سلطان صاحب مجسٹریٹ کو پریزائڈنگ آفیسر مقرر کر کے انتخابی مہم شروع کر دی ۔ مولانا عنایت حسین صاحب نے اس مہم میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا ۔ موصوف نے اپنے رفقاء سے مشورہ کر کے ادارہ کے عہدیداران اور انتظامیہ کے اراکین کے نام تجویز کر کے آغا باقر سلطان صاحب کو بھجوا دئے ان میں صدارت کے لئے پرنس عباس مرزا صاحب اور جنرل سکریٹری کیلئے رضا میرزا صاحب ایڈوکیٹ اور مولانا عنایت حسین کا نام جوائنٹ سکریٹری کیلئے تجویز کئے گئے

تھے ۔ کچھ احباب نے علامہ رشید ترابی صاحب سابق صدر کا نام تجویز کیا تھا لیکن موصوف نے اپنا نام واپس لے لیا تھا ۔ اس طرح تمام عہدیداران اور انتظامیہ کے اراکین کا انتخاب بلامقابلہ ہوگیا۔ اس انتخاب کے بعد پرنس عباس میرزا صاحب نے نگار ہوٹل میں ایک شاندار عصرانہ دیا جس میں کافی تعداد میں اکابرین وعمائدین اور ورکروں نے شرکت فرمائی ۔

۱۰ ۔ ۱۹۵۹ء میں پہلی مرتبہ بنیادی جمہوریت کے انتخابات ہوئے جس میں ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کے دو ورکروں مولانا عنایت حسین اور سید انوار حسین جعفری کامیاب ہوئے ۔ پرنس عباس مرزا صاحب صدر ادارہ نے انکے اعزاز میں اپنی کوٹھی پر ایک پرتکلف عصرانہ دیا جس میں عہدیداران اور ادارہ کے ورکروں نے شرکت کی اور ان دونوں کامیاب ورکروں کو مبارکباد پیش کی ۔

۱۱ ۔ میرے ۱۹۶۱ء میں کراچی سے راولپنڈی منتقل ہوجانے کے بعد مولوی سید محمد صاحب دہلوی نے شیعہ مطالبات کمیٹی کے نام سے ایک تحریک شروع کی جس کے صرف یہ دو مطالبات تھے کہ کالجوں اور اسکولوں میں شیعہ طلباء کیلئے علیحدہ دینیات کا بندوبست کیا جائے اور انہیں سنی دینیات پڑھنے پر مجبور نہ کیا جائے ۔ دوسرے یہ کہ شیعوں کو عزاداری کی پوری آزادی دی جائے ۔ اس تحریک کو منظم طور پر چلانے کیلئے ملک بھر کی شیعہ بستیوں کا مولانا سید محمد صاحب نے دورہ کیا ۔ مولانا عنایت حسین صاحب مولوی سید محمد صاحب کے مشیر کے طور پر جملہ امور انجام دے رہے تھے ۔ بالاخر ایک تاریخ مقرر کرکے مولوی سید محمد صاحب نے حکومت کو نوٹس دیدیا کہ اگر اس تاریخ تک شیعہ مطالبات منظور نہ ہوئے تو شیعہ احتجاجی تحریک شروع کردیں گے ۔ مقررہ تاریخ پر ملک کے کونے کونے سے

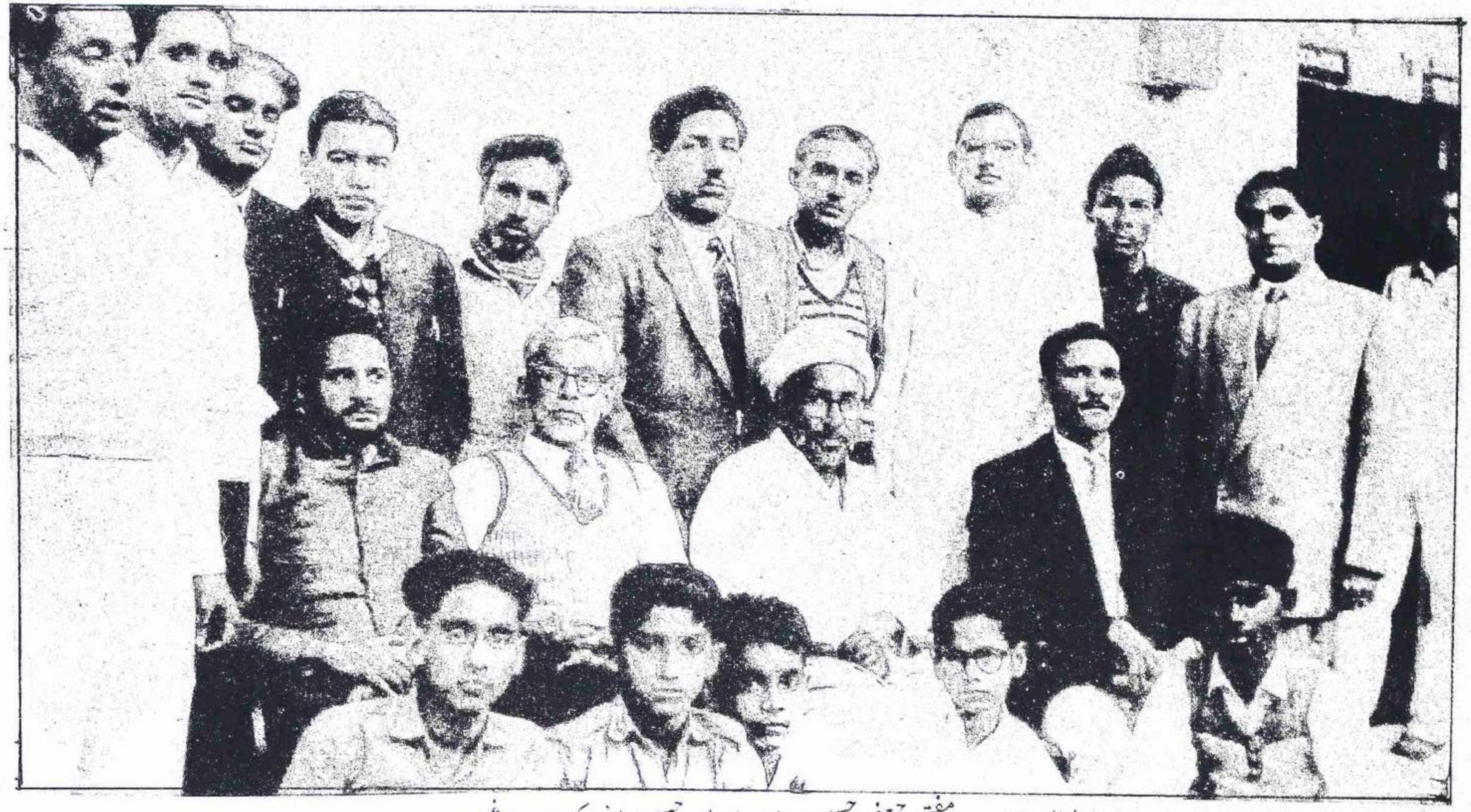

مولانا صاحب ، مفتی جعفر حسین ، اور اسرار حسین ایڈوکیٹ وغیرہ

شیعہ قافلے راولپنڈی میں ڈاکٹر اجمل حسین رضوی کی کوٹھی پر پہنچ گئے ۔ نازک صورت حال دیکھ کر حکومت نے راتوں رات اخبارات میں اور ریڈیو پر یہ اعلان کردیا کہ حکومت نے شیعوں کے مطالبات تسلیم کرلئے ہیں ۔ شیعوں نے پر امن جلوس بھی نکالا لیکن کچھ دور جا کر خود ہی منتشر ہوگئے ۔ یہ حکومت کی ایک کامیاب ڈپلومیسی تھی ۔

۱۲ ۔ جنرل محمد ضیاء الحق کے عہد صدارت میں شیعوں کو پھر جدوجہد کرنا پڑی ۔ کیونکہ صدر صاحب نے اسلامی قوانین کے نفاذ کے نام پر کچھ ایسے آرڈیننس جاری کر دئے جو ہمارے عقائد کے خلاف تھے اور زبردستی زکواۃ کاٹنا شروع کردی ۔ مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ نے جو اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن تھے احتجاجاً اس منصب سے استعفیٰ دیدیا اور تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے صدر کی حیثیت سے شیعوں کو منظم کرنے کیلئے ملک بھر کا دورہ کیا ۔ بالاخر ایک دن اسلام آباد میں پہلے ایک عظیم الشان جلسہ ہوا اور

اسکے بعد ایک احتجاجی جلوس نکالا ۔ جس میں ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد نے شرکت کی ۔ راستے میں پولی کلینک کے آگے نکل کر پولیس نے مجمع کو منتشر کرنے اور سیکرٹریٹ کی طرف جانے سے روکنے کیلئے پرامن اور نہتے لوگوں پر لاٹھی چارج ، فائرنگ اور اشک آور گیس کے گولے پھینکنے شروع کردئے جس سے دو افراد موقعہ پر ہی ہلاک ہوگئے ۔ لیکن جلوس مفتی صاحب کی قیادت میں مسلسل آگے بڑھتا رہا اور بالاخر سکریٹریٹ پر جا کر دھرنا مار کر بیٹھ گئے ۔ آخر جنرل محمد ضیاء الحق نے شیعہ نمائندگان کو گفت وشنید کیلئے ایوان صدر میں بلا اور نتیجہ میں ایک معاہدہ طے پاگیا جس پر تاہنوز عملدرآمد نہیں ہوسکا ۔ تاہم اس معاہدہ کی رو سے اب شیعوں سے زبردستی زکواۃ نہیں کاٹی جاتی اور ۱۹۷۳ء کے آئین میں

ایک آرڈیننس کے ذریعہ اس وضاحت کو شامل کر دیا گیا۔ جو ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۲ء کے عبوری آئینوں میں شامل چلی آرہی تھی لیکن بھٹو صاحب کے دئے ہوئے آئین ۱۹۷۳ء میں اس کو نظر انداز کر دیا گیا تھا یعنی پرسنل لاء کی حد تک "قرآن وسنت" کا مفہوم کسی اسلامی فرقے کیلئے وہی لیا جائے گا جو اس فرقے کے لئے مسلمہ ہوگا۔ اس تحریک میں بھی مولانا عنایت حسین جلالوی نے جان توڑ کوشش کے ساتھ حصہ لیا اور بہت سے رضاکار اسلام آباد بھجوائے۔

۱۳۔ کراچی میں کوئی دس بارہ سال سے مولانا عنایت حسین صاحب جلالوی، سید محمود الحسن رضوی صاحب، ڈاکٹر ندیم الحسن نقوی (جنہیں اب ظالموں نے بے گناہ قتل کر دیا ہے) اور ان کے ہم خیال اہل قلم حضرات نے مجلس ملی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہوا ہے جس کا مقصد تصنیف و تالیف کے ذریعہ دینی اور قومی امور کی نشرواشاعت کرنا ہے۔ اس کے اراکین ان امور پر کتابیں اور مقالات لکھتے ہیں اور جو کچھ بھی لکھتے ہیں اس پر سب بیٹھ کر غوروفکر اور تنقید وتبصرہ کرتے ہیں اور پھر اسے کتابی شکل میں شائع کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ادارہ نے کئی سال تک مسلسل بہت بڑے پیمانے پر یوم امام جعفر صادق علیہ السلام منایا جس میں مفکرین وعلمائے کرام مقالے پڑھتے تھے۔ ان مقالات کو بعد میں مجلے کی شکل میں شائع کیا جاتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اب بھی یہ دن اسی طرح منایا جاتا ہے یا نہیں۔ اس ادارہ کی کامیابی کے لئے بھی مولانا عنایت حسین جلالوی نے بڑی کاوش سے کام کیا اور دوسرے شہروں میں جا جا کر بھی اپنی تقریروں میں اس ادارہ کو متعارف کرایا۔ اس کی دو ایک نشستوں میں ناچیز کو بھی شرکت کا موقعہ ملا ہے۔

۱۴۔ آخر میں مولانا عنایت حسین جلالوی کی معاشی زندگی پر جب میں طائرانہ نظر ڈالتا ہوں تو بڑے دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا اتنی علمی قابلیت اور بااثر وصاحب ثروت کے ساتھ گہرے مراسم رکھتے ہوئے زندگی کے ابتدائی دور میں معاشی اعتبار سے خوشحال نہیں رہے۔ ان کے مزاج میں قناعت اور وضعداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ انہوں نے کبھی کسی عزیز یا دوست کے آگے دست سوال نہیں پھیلایا اور نہ کسی سے قرض لیا۔ بلکہ کبھی کسی کو یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ان کو تنگدستی کا سامنا ہے۔ یارو احباب کے ساتھ اسی طرح کھانا پینا اور ملنا جلنا رکھتے تھے جیسے فراغ دستی میں رکھتے ہیں ۔ طمع ولالچ ان کے قریب سے بھی نہیں گذرا تھا جیسا کہ اس مضمون کے پیراگراف نمبر ۲ میں بیان کر چکا ہوں پہلے مولانا دستور ساز اسمبلی تعلیمات اسلامی بورڈ کے دفتر میں ملازم رہے ۔ جو بھی تنخواہ ملتی تھی اس سے گذر اوقات کرتے تھے یہ ملازمت غالباً ۱۹۵۵ء تک رہی ۔ اس کے بعد یہ دفتر بھی ختم ہوگیا اور مولانا صاحب کو بھی فارغ کردیا گیا ۔ اس کے علاوہ مولانا محمد رضی صاحب قبلہ کے حسینی ہائی اسکول میں بطور معلم دینیات مقرر ہوئے۔ اس کے بعد پرمیئر کالج میں پروفیسر ہوئے ۔ قدرت مہربان ہوئی تو اس کالج کو گورنمنٹ نے نیشنلائز کر دیا اور اس ملازمت سے ریٹائر ہوگئے ۔ اب خدا کے فضل سے بچے بھی کمانے کے قابل ہوگئے تھے۔ مولانا نے تین لڑکیوں اور بڑے لڑکے کی شادیاں کردی تھیں ۔ ابھی دو لڑکوں کی شادیاں کرنا تھی کہ ظالم موت نے اس عظیم اور بے مثل شخصیت کو دنیا سے اٹھا لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے ۔۔۔

پروفیسر سید غلام عباس

۱۹۹۴ء کا سال بڑا دلسوز اور جان لیوا ثابت ہوا ۔ سب سے پہلے تو علامہ عباس حیدر عابدی مرحوم ۳۱ جنوری کی صبح کو اللہ کو پیارے ہوگئے ۔ مرحوم کی رحلت کا صدمہ ہی کیا کم تھا کہ ۲۲ اپریل کو دل دہلا دینے والا اور روح فرسا سانحہ پیش آیا اور ڈاکٹر ندیم الحسن کو ان کے اپنے گھر کے اندر بڑی بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ ابھی ڈاکٹر ندیم شہید کے سانحے سے دل کا زخم مندمل نہ ہو پایا تھا کہ مولانا عنایت حسین جلالویؒ مرحوم نے ۹ اکتوبر کی شب کو دائمی اجل کو لبیک کہا اور خالق حقیقی سے جاملے۔ ۹ ماہ کے اندر تین عظیم شخصیتیں ہم سے جدا ہوگئیں ۔ ان مرحومین میں سے ہر شخص اپنی اپنی زندگی کے دوران بڑی منفرد شخصیت کا حامل تھا ۔ علامہ عابدی شہرت ومقبولیت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ، ڈاکٹر ندیم خدمت وایثار کا نمونہ تھے اور شیعی ادب سے قوم کو مالا مال کرنے کی سعی میں مصروف تھے اور مولانا جلالویؒ زہد وتقویٰ ۔ نیکی وپارسائی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

مولانا عنایت حسین جلالوی مرحوم کا آبائی وطن علی گڑھ میں جلالی نام کا ایک قصبہ تھا ۔ اس قصبے میں مومنین کی اچھی خاصی تعداد تھی ۔ اس قصبے نے غیر منقسم ہندوستان میں نامور ہستیاں پیدا کیں۔ استاد قمر جلالوی مرحوم کا تعلق بھی اسی دیار سے تھا پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد لاکھوں تارکین وطن مسلمانوں کی طرح انہوں نے بھی اس مملکت خداداد کو ترجیح دی اور بھارت میں رہنا گوارا نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے گمبھیر مسائل پیدا

ہوگئے تھے ۔ ان میں ایک بڑا مسئلہ معیشت کا بھی تھا کیونکہ قائد اعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت نے یہ نعرہ لگایا تھا کہ پاکستان برصغیر کے دس کروڑ یا عرف عام میں تمام کے تمام مسلمانوں کا مسکن ہوگا ۔ ایسی صورت میں ہندو تقریباً ہر ہر مسلمان کو یہ طعنہ دیتا کہ جب بھارت ماتا کے جسد کے ٹکڑے کرا دئے اور بٹوارہ ہوگیا تو پھر تقسیم کے بعد ہندوستان میں ڈٹے رہنا ہٹ دھرمی کے علاوہ اور کیا تھا۔ معاشی اور سماجی مسائل تو اپنی جگہ ، لاکھ ہا لاکھ مسلمانوں نے جو تقسیم کے بعد بھی ہندوستان میں خوشحال اور باعزت زندگی گزار رہے تھے محض نفسیاتی بنیادوں پر ہجرت کی کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی آرزوؤں کے اس چمن کو پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے تھے جس کے حصول کے لئے انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا ۔ مولانا جلالوی مرحوم کا تعلق بھی ہندوستانی مسلمانوں کے اس گروہ سے تھا جو نظریاتی بنیادوں پر اور بڑے نیک واعلیٰ جذبے سے سرشار ہو کر پاکستان آیا تھا۔ حالانکہ عنایت حسین جلالوی کے پاس علی گڑھ میں معقول جائیداد تھی اور ان کی شریک حیات کی جائیداد تو مرحوم کی جائیداد سے کہیں زیادہ تھی ۔ بڑی آسانی سے گزر بسر ہوجاتی ۔ لیکن جس شخص نے تحریک اور تشکیل پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہو بھلا وہ تعمیر پاکستان میں کیوں اور کیسے پیچھے رہ جائے ۔ چنانچہ اپنی شریک حیات کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے مہاجر بن گئے ۔

مولانا جلالوی مرحوم مدرستہ الواعظین لکھنو اور مدرسۂ جوادیہ بنارس سے فارغ التحصیل تھے ۔ وہ دینی علوم میں تو ید طولیٰ رکھتے تھے اردو ان کی مادری زبان تھی ، دینی علوم میں مہارت کے ناطے عربی وفارسی زبانوں میں بھی خاصا درک رکھتے تھے اور اسی کے ساتھ انگریزی زبان کی شدبدھ بھی ۔ مجلس پڑھنے کا شوق چونکہ انہیں ورثے میں ملا تھا اس لئے خطابت میں بھی

ان کا اپنا ایک مقام تھا۔ ان کی ذاکری پیشہ ورانہ ہرگز نہ تھی اور نجی زندگی میں پاکیزگی و طہارت کی مانند خطابت کے میدان میں بھی انہوں نے اپنے اعلیٰ کردار کو برقرار رکھا۔ گو کہ مولانا صاحب مرحوم کوئی مشہور زمانہ خطیب نہ تھے لیکن چونکہ منبر رسولؐ کی عظمت وحرمت کے دل سے قائل تھے اس لئے محمدؐ وآلؐ محمدؐ کی رحمتیں ان پر نازل ہوئیں اور اسی منبر کے صدقے میں وہ امریکہ ، افریقہ اور سعودی عرب مجالس پڑھنے کی غرض سے تشریف لے گئے اور اسی کے سبب حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی سرفراز ہوئے ۔ پریمیئر کالج میں ان کا تقرر اس وقت ہوا جب وہ ادارہ اپنی شہرت کی انتہائی بلندیوں پر پہونچ گیا تھا اور بہت چنیدہ افراد ہی اس درسگاہ میں منتخب ہو پاتے تھے ۔ تعلیمی اداروں کو ۱۹۷۲ء میں قومی تحویل میں لئے جانے کے بعد بھی مولانا جلالوی مرحوم ایک طویل حد تک اسی ادارے سے منسلک رہے اور درس وتدریس میں منہمک رہے۔ ۱۹۸۹ء میں وہ اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے بڑی عزت ووقار کے ساتھ ریٹائر ہوگئے۔

مولانا جلالوی مرحوم معلم ، مقرر ، مبلغ اور مفکر تو تھے ہی وہ بڑے اچھے انسان بھی تھے ۔ انسان دوست ، علم دوست اور اقدار دوست ۔ انہوں نے ساری زندگی کرتہ ، پاجامہ اور شیروانی کے علاوہ کوئی دوسرا لباس زیب تن نہیں کیا ۔ راقم الحروف نے جب بھی انہیں گھر سے باہر دیکھا ، بغیر ٹوپی کبھی نہیں دیکھا ۔ کبھی اونچی آواز میں گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا ۔ مولانا کے لہجے میں ایک قسم کی مٹھاس تھی ۔ عالم دین ہونے کے ناطے وہ صوم وصلواۃ کے پابند تو تھے ہی لیکن وہ اسلامی ومشرقی روایات کے امین بھی تھے قول کے ایسے صادق کہ جو بات کہدی وہ پتھر کی لکیر تھی اور غیور ایسے کہ کڑے سے کڑے وقت میں بھی انہوں نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا اپنی زندگی میں مولانا نے سیکڑوں مجالس بلامعاوضہ ضرور پڑھی ہوں گی اور

اسی طرح سے سیکڑوں عقد بھی پڑھائے ہوں گے ۔ میں شاہد ہوں کہ بارہا انہوں نے اس وقت مجالس پڑھیں اور نکاح پڑھائے جب ان کی جیب بالکل خالی ہوتی ۔ صاحب خانہ معاوضے کا اصرار بھی کرتا لیکن وہ سختی سے انکار کردیتے ۔ یہ تھا اعلیٰ اخلاق اور کردار کا نمونہ صاحب ثروت یا معاشی طور پر خوشحال آدمی اگر معاوضہ نہ لے تو کوئی بڑی بات نہیں لیکن قلیل آمدنی والا شخص کسی بھی آتی ہوئی رقم کے لئے انکار کردے تو یہ یقیناً اس شخص کی رفعت کردار کے علاوہ اور کیا بات ہو سکتی ہے ؟

مولانا جلالوی مرحوم کے اوصاف حمیدہ اور صفات عالیہ یوں تو بہت تھے لیکن ایک صفت جو مرحوم کو دوسرے علماء واکابرین سے ممتاز کرتی تھی وہ قوم سے ان کا خلوص تھا ۔ وہ ملت جعفریہ کے ہر ہر فرد کو علم وہنر کی انتہائی بلندی پر دیکھنے کے شدید خواہشمند تھے۔ غیر منقسم ہندوستان میں اس ملت سے تعلق رکھنے والے زندگی کے تمام شعبوں میں نہ صرف بڑے بڑے منصب پر فائز تھے بلکہ علم وتقویٰ میں دیگر اقوام کے مقابلے میں بڑی انفرادی حیثیت کے مالک تھے ۔ لیکن تشکیل پاکستان کے بعد دھیرے دھیرے اس قوم سے علم وتقویٰ کوسوں دور چلا گیا اسی لئے مولانا اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ " ہم نے اس ملک میں ترقی معکوس کی ہے " ۔ مولانا کو اس بات کا بھی بڑا قلق تھا کہ سادات کے گھرانے سے تعلق رکھنے والی بیشتر سیدانیوں نے پردے کو پس پشت ڈال دیا ہے ۔ اسی طرح جلالوی صاحب مرحوم ملت میں بے جا اسراف کے خلاف تھے ۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کو نہ ہمارے حلیم اور نہ ہی شیرمالوں کی ضرورت ہے انہیں اس جذبہ کی ضرورت ہے جس کے تحت انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کردیا ۔ مولانا جلالوی کی شدید خواہش تھی کہ سرفروشان ملت کراچی سے لے کر پارہ چنار تک زندگی کے مختلف شعبوں کے تعلق رکھنے والے ادارے قائم کریں ۔

ان مختلف نوعیت کے اداروں میں ایک ایسی عالیشان دانشگاہ بھی ہو جو نہ صرف اپنی مثال آپ ہو بلکہ اس درسگاہ سے فیضیاب ہو کر ایسے مثالی نوجوان میدان عمل میں آئیں جو اپنے علم ، شعور وآگہی نیز اپنے اعلیٰ وارفع کردار سے گمشدہ عظمت کو جلد بحال کردیں ۔ مولانا کی اس فکر میں ان کے چالیس سالہ تجربات و احساسات کو بڑا دخل تھا ۔ وہ ملت جعفریہ کی تقریباً ہر بڑی تحریک سے وابستہ رہے تھے اور تقریباً تمام شیعہ زعماء بشمول مفتی جعفر حسین مرحوم سے بڑے قریب رہ چکے تھے ۔ ان کی فکر ان کے تجربے کا نچوڑ تھی ۔ چنانچہ اصلاح قوم کی خاطر ۱۹۷۴ء میں مرحوم نے ایک غیر سیاسی جماعت کی " مجلس ملی " کے نام سے داغ بیل ڈالی ۔ اس جماعت کو ابتدائی برسوں میں اہلیان کراچی میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ۔ اس کے ہاتھوں کچھ تعمیری کام بھی انجام پائے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ بد قسمتی سے یہ غیر موثر اور غیر فعال ہو گئی ۔ مولانا مرحوم کو مجلس ملی کی ناکامی پر بڑا دکھ تھا اور ان کے قلبی مرض کا ایک بڑا سبب اس جماعت کی ناکامی تھی ۔

مولانا جلالوی مرحوم کو حضور سرور کائناتؐ ، چہاردہ معصومین علیہم السلام اور شہدائے کربلا سے بڑی عقیدت تھی ۔ مولانا چونکہ حج بیت اللہ کرچکے تھے اور اس کے ساتھ روضہ نبویؐ و جنت البقیع کی زیارتیں بھی اس لئے ایران ، عراق وشام کی زیارتوں کے لئے ان کے دل میں بڑی تڑپ تھی ۔ ۱۹۹۳ء میں جب راقم الحروف کا زیارات کے لئے مصمم ارادہ ہو گیا تو میں نے اس کا ذکر مرحوم سے کیا۔ جلالوی صاحب نے کہا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ میں نے کہا " مولانا ! آپ کی حالت تو یہ ہو رہی ہے کہ دو قدم چلنے میں لڑکھڑا رہے ہیں ۔ ابھی ایک ہفتے قبل آپ دل کے ہسپتال میں داخل تھے ۔ اتنا طویل سفر آپ کیسے کریں گے ! جب کہ یہ سفر بذریعہ ریل وبس ہے ؟ " جواب دیا " میں راستے میں جہاں بھی مرجاؤں وہاں دفن کر دیجئے

گا لیکن میں چلوں گا ضرور" ۔ میرے علاوہ اور دوستوں نے بھی مولانا کو سمجھایا لیکن انہوں نے کسی کی بات نہ مانی اور قافلے کے ساتھ روانہ ہوگئے ۔ روانگی کے وقت مولانا صاحب کی حالت اس قدر تشویشناک تھی کہ ہر شخص ان کی صحت کے لئے اللہ سبحانہ تعالیٰ کے حضور دعا گو تھا ۔ کراچی سے قم کا ۴ روزہ لگاتار سفر تھا جو نہ صرف صبر آزما تھا بلکہ بہت تھکا دینے والا بھی ۔ سارے سفر مولانا کبھی غش میں ہوتے اور کبھی بیدار ۔ مجھ سے اور دیگر ساتھیوں سے جتنی خدمت ہو سکی اس میں کوئی کسر نہ چھوڑی ۔ قم سے ہمارا قافلہ عراق کے لئے روانہ ہو گیا اور تیسرے دن ہم کاظمین پہونچ گئے جو بغداد کا ایک حصہ ہے ۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مرحوم کو دیگر آئمہ کی طرح بڑی عقیدت تھی اور ہر سال ان کی شہادت کی تاریخ پر مولانا ایک مجلس منعقد کرتے تھے ۔ جیسے ہی مولانا امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے روضۂ اقدس میں داخل ہوئے بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے ۔ امامت کی اس ساتویں منزل کو باب الحوائج کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے ۔ اسی در سے ان کو صحت ملی ۔ مولانا کے جسم سے تمام نقاہت وکمزوری کے نشان جاتے رہے اور چہرے پر عجب بشاشت آگئی ۔ کاظمین کے بعد ہمارا سفر کربلا کا تھا ۔ کربلا ہر مومن کا سرمایۂ حیات ، ہر حسینی کی دل کی صدا اور ہر حیدری کی تمناؤں اور آرزوں کا مرکز ۔ جیسے جیسے ہم کربلائے معلیٰ کے نزدیک پہونچ رہے تھے مولانا کے چہرہ پر خوشی ، انبساط اور سکون کے عجب نقوش ابھر رہے تھے کربلا آج بھی انسانیت کا جوہر اور نورانیت کا پیکر ہے ، کربلا آج بھی درس کا ایک پیغام اور عزم کا رمز مدام ہے ۔ اگر کاظمین نے مولانا کو صحت بخشی تو کربلا نے توانائی ۔ جلالوی صاحب بالکل توانا ہوگئے ۔ پھر سارے سفر ان کو نہ کوئی تکلیف ہوئی اور نہ ہی انہوں نے کمزوری محسوس کی ۔

مولانا جلالوی مرحوم کے پسماندگان میں ان کی زوجہ محترمہ کے علاوہ

تین بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں ۔ تینوں بیٹیاں شادی شدہ ہیں ۔یوں تو ان کا ہر داماد خوشحال اور معزز زندگی گزار رہا ہے لیکن عزیزم تنظیم حسین صاحب کی چشم بددور بڑی نکھری ہوئی حیثیت ہے ۔ موصوف خود بھی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں اور ایک فرم کے مالک ہیں ۔ فرزندگان میں مصدق میاں ، حسن میاں اور سلمان سلمہ ہیں ۔ مصدق میاں ماشااللہ شادی شدہ ہیں ، حسن میاں کچھ عرصے مشرق وسطیٰ میں رہ کر وطن واپس ہوئے ہیں ۔ سلمان سلمہ سے مجھے بڑی امیدیں وابستہ ہیں قدرت نے انہیں نطق کے جوہر سے نوازا ہے ۔ وہ بہت شعلہ بیان مقرر ہیں اور اگر ریاض جاری رکھا تو مستقبل ان کا بہت تابناک ہے ۔

جب بھی کسی عزیز یا دوست کا انتقال ہوجاتا ہے تو تدفین کے وقت پتہ نہیں کیوں ثاقب لکھنوی کا مندرجہ ذیل شعر میرے ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے ۔

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

لیکن مولانا جلالوی مرحوم کی تدفین کے وقت مجھے ایک مصرعے نے مستقبل تڑپا رکھا تھا ۔ جیسے مولانا مجھ سے کہہ رہے ہوں ۔

دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

علامہ عابدی بڑے نامور اور مشہور خطیب تھے ۔ انہوں نے اپنی زندگی کے دوران سیکڑوں مجالس سے حطاب کیا ہوگا ۔ ان کی بخشش کے لئے وہ مجالس ہی کیا کم ہیں ؟ پھر ۱۹۸۳ء میں مرکزی امام بارگاہ کے مومنین کی جس نازک وقت پر خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے ۔ ڈاکٹر ندیم شہادت کے مرتبے پر فائز ہوچکے ہیں ۔ شہید کے لئے ابدی حیات ہے اور مولانا جلالوی

بھی عظمت کردار کی بدولت امر رہیں گے لیکن ۹۴ء نے ان تینوں ہستیوں کو ہم سے چھین لیا۔ بالحقیقت یہ تینوں افراد محبت وخلوص کا نشان تھے، رفعت و عظمت کا آسمان تھے۔ مگر۔

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

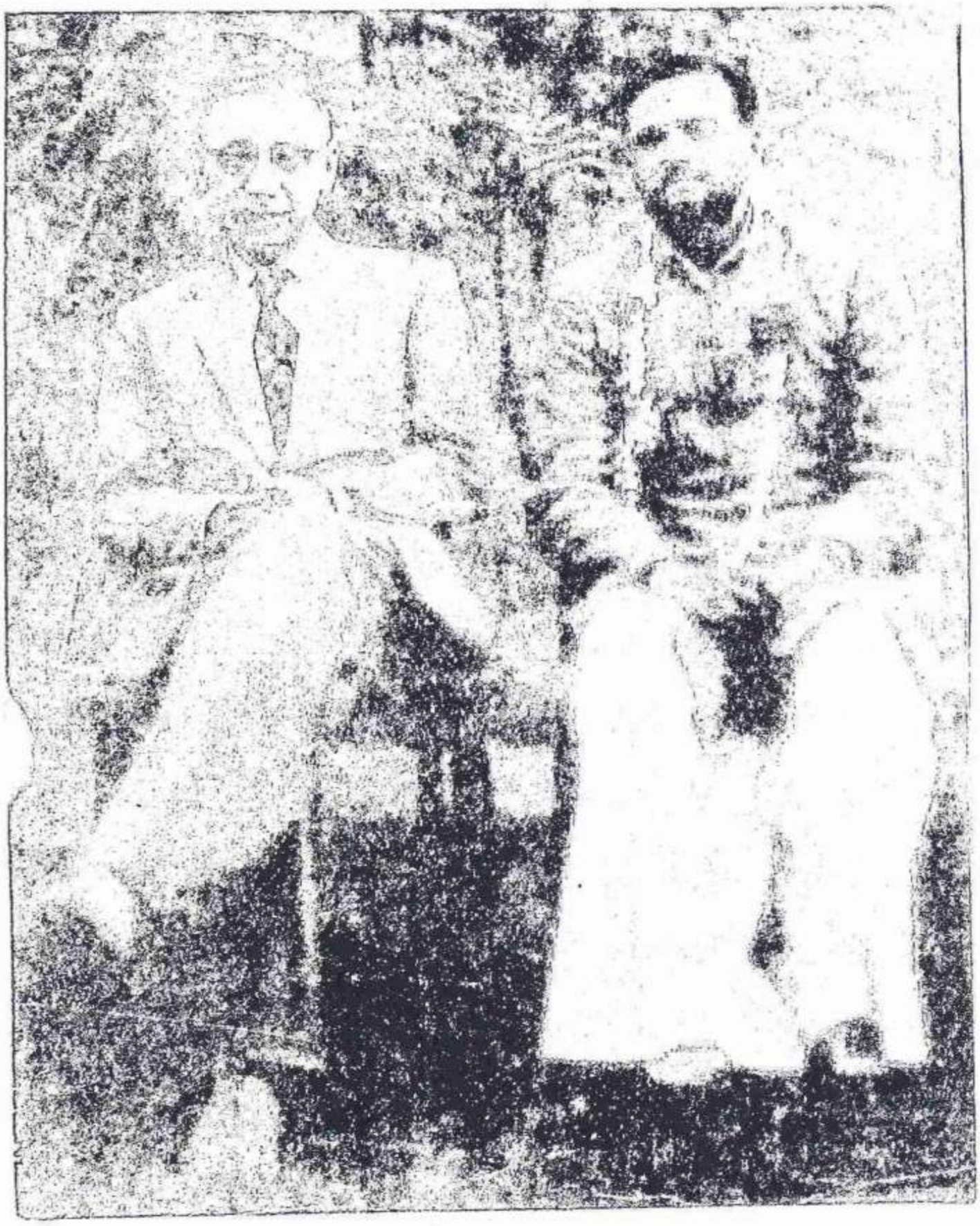

بی۔ ڈی ممبر منتخب ہونے کے بعد پرنس عباس مرزا کے ساتھ

موت العالم موت العالم

پروفیسر علی محسن صدیقی
شعبہ علوم اسلامی جامعہ کراچی

مولانا عنایت حسین جلالوی سے اب سے کوئی ستائیس اٹھائیس سال پہلے حیدر آباد کالونی کے ایرانی کیفے ٹیریا میں ملاقات ہوئی ۔ یونی ورسٹی سے واپسی پر میرا اور میرے رفیق کار پروفیسر مولانا سید مظفر حسین زیدی کا یہ معمول تھا کہ اسٹاف بس سے اتر کر ہم وہاں چائے پیتے اور اس کے بعد شہر چلے جاتے تھے ۔ ایک سہ پہر کیفے ٹیریا کے پاس کھڑے ہوئے ایک صاحب سے ہماری ملاقات ہوئی ، وہ مولانا مظفر حسین کے انتظار میں کھڑے تھے ۔ تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ کسی مدرسہ میں عربی اور دینیات کے استاد ہیں اور پریمیئر کالج میں اسلامیات کی لکچرشپ کے امیدوار ہیں ۔ کئی ملاقاتوں کے بعد مولانا عنایت حسین صاحب کالج میں اسلامیات کے استاد ہوگئے اور اس تعلق سے یونی ورسٹی میں آنے جانے لگے ۔ پھر مولانا شعبہ معارف اسلامیہ میں معاون استاد کی حیثیت سے مقرر ہوگئے اور یوں اکثر و بیشتر یونی ورسٹی آنے لگے ۔ اس زمانہ میں مولانا جلالوی جیل روڈ کے قریب رہتے تھے ۔ اس کے بعد فیڈرل " بی " ایریا کے بلاک نمبر ۸ اور ۹ سے متصل لیسین آباد میں انہوں نے اپنا مکان بنوا لیا اور وہیں اٹھ آئے ۔ ان کی اس نقل سکونت سے

یہ فائدہ ہوا کہ وہ روزانہ یونی ورسٹی جانے کے لئے وہی بس استعمال کرتے جس میں ، میں یونی ورسٹی جاتا تھا اور اس طرح ہر روز مولانا سے ملاقات ہوتی اور یونی ورسٹی میں تدریسی اوقات سے پہلے اور اس کے بعد میرے شریک صحبت ہونے لگے اور وہ تعلق جو اتفاقیہ ہوا تھا خاصا مضبوط ہو گیا ۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ مولانا مرحوم کی قرابت داری میرے دوست پروفیسر سید محمد جعفر سے ہو گئی اور اس تعلق سے یونی ورسٹی کے باہر بھی ان سے ملاقاتیں ہونے لگیں ۔ یہ سلسلہ یونی ورسٹی سے ہمارے تعلق تک ہی جاری نہ رہا بلکہ یونی ورسٹی سے وظیفہ یابی کے بعد بھی قائم رہا ، ہر چند کہ اس میں بعض طویل وقفے بھی آئے مگر مولانا مرحوم کے خلوص میں کبھی کمی نہ آئی ۔ آج جب ان کی موت کی اطلاع برادرم پروفیسر سید محمد جعفر سے ملی تو مولانا مرحوم سے تعلقات کی ستائیس بہاریں میں ایسا معلوم ہوا کہ خزاں کی آغوش میں دم توڑ گئیں ۔ سچ ہے زندگی بہار بے خزاں نہیں ہے یہاں کی بہار خزاں بدوش اور یہاں کی زندگی مرگ آغوش ہے۔

مولانا سید عنایت حسین مرحوم یو پی کے مشہور ضلع علی گڑھ کے قصبہ جلالی کے رہنے والے تھے ۔ جلالی کا قصبہ اسلامی دور میں بڑی اہمیت کا مالک تھا ، یہاں کی خاک سے اس عہد کے کئی علماء وفضلاء اٹھے اور آسمان علم وفضل کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے ۔ جلالی، صحیح النسب سادات کی بستی تھی ، آزادی کے بعد وہاں سے متعدد شریف خاندان ہجرت کر کے پاکستان آگئے ۔ انہیں میں مولانا سید عنایت حسین صاحب مرحوم کا خاندان بھی تھا ۔ مولانا عنایت حسین مرحوم نے ابتدائی دینی تعلیم اپنے بزرگوں سے جلالی ہی میں حاصل کی ، اس کے بعد وہ تکمیل کی غرض سے لکھنو آئے اور وہاں کی مشہور درس گاہ ناظمیہ عربی کالج سے سند فراغ حاصل کی ۔ ان کے اساتذہ میں فاضل بزرگ مولانا سید محمد رضی صاحب کو نمایاں مقام حاصل

ہے۔ مولانا سید محمد رضی صاحب کو بھی اپنے اس شاگرد سے بڑی محبت تھی اور شاگرد واستاد کا یہ تعلق رسمی نہ تھا بلکہ دل کی گہرائیوں اور خلوص کی کارفرمائیوں سے عبارت تھا۔ میں نے ایک موقع پر جب مولانا جلالوی کی دختر کی رسم نکاح تھی انہیں مولانا رضی صاحب کی آمد کے لئے سراپا انتظار بلکہ یک گو نہ مضطرب دیکھا۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ یہ نکاح ان کے استاد پڑھائیں۔

مولانا جلالوی مرحوم مرنجان مرنج انسان تھے وہ نرم گفتار، خوش کردار اور پابند اوقات تھے میں نے کبھی انہیں تلخ کلام اور تند گفتار نہ پایا۔ ان میں ایک ایسا خلوص تھا جسے ہر شخص محسوس کرسکتا تھا۔ ان کی خندہ پیشانی ان کے خاندانی پس منظر کی آئینہ دار تھی۔ آدمی اپنے حال سے مایوس بلکہ بیزار رہتا ہے۔ لیکن میں مایوس نہیں ہوں کہ اسی حال سے مولانا جلالوی مرحوم جیسا شریف انسان تعلق رکھتا تھا۔ اور نہ میں مستقبل سے مایوس ہوں کہ الیاسُ کفرٌ۔ میری دعا ہے کہ مولانا مرحوم کے اخلاف اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کی اعلیٰ اخلاقی و انسانی اقدار کی پاسداری کریں اور اپنے شریف باپ کی شرافت کو اپنا رہنما بنائیں۔ آمین!

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمیں باد۔

پیکرِ خلوص

جناب جعفر بھائی نذر علی

حضرت پروفیسر سید عنایت حسین جلالوی اعلیٰ اللہ مقامہ کی تعریف و توصیف میرے لئے ناممکن نہیں تو کم از کم بے حد مشکل ضروری ہے ۔ یوں تو ان کی ذات خوبیوں اور صفات کا مرقع تھی لیکن مجھے ان کی جس خوبی نے سب سے زیادہ مرعوب ومتاثر کیا وہ طمع اور حرص وہوس سے انکی دوری تھی ۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں یقیناً اتنے سادگی پسند اور پرخلوص افراد صرف دو چار ہی دیکھے ہیں اور ان میں مولانا مرحوم بھی شامل ہیں ۔

مولائے کائنات امیر المومنینؑ کا قول ہے کہ دوست کی دوستی سفر کی مشکلات اور مصائب میں آزماؤ اور میں اور مولانا مرحوم تین برس تک کاروبار کے سلسلے میں گلگت کے جنگلات میں گھومتے رہے اس عرصے میں مولانا مرحوم کی الفت و محبت ، کاروباری امور میں ان کی دلچسپی اور محنت شاقہ کو میں شاید کبھی فراموش نہ کرپاوں ، وہ جن کٹھن حالات اور سخت سردی کے باوجود ہمارے کاروبار کے سلسلے میں شمالی علاقہ جات میں مقیم رہے یہ صرف انہی کی ذات سے ممکن تھا ۔ مختصر یہ کہ مولانا مرحوم ایک کامیاب انسان تھے ، ایک انتہائی کامیاب اور رہنما زندگی کے نقوش چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوئے ۔ یقیناً وہ وہاں بھی کامیاب وکامران ہیں اور یہاں ان کے ورثاء کی کامیاب اور نیک زندگی کیلئے میں دعا گو ہوں ۔

اعلیٰ صفات کا حامل انسان

شیخ محمد شریف
سابق انکم ٹیکس کمشنر

اس فانی دنیا میں یقیناً قرار اور دوام کسی کو نہیں کچھ چلے گئے اور کچھ چلے جائیں گے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے چلے جانے کا غم زندگی کا روگ بن جاتا ہے جو بظاہر فرد واحد ہوتا ہے لیکن اپنی ذات میں ایک ادارہ اور انجمن اور جب ایسا کوئی دوست بچھڑ جائے تو پھر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سارا شہر لوگوں سے خالی ہو گیا اور شہر کے بام ودر اپنی بربادی پر نوحہ کناں ہیں ۔

مولانا سید عنایت حسین جلالوی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جن کی جدائی صرف ان کے اہل خانہ اور احباب کے لئے ہی صدمہ جانکاہ نہیں بلکہ ساری ملت کا غم مشترکہ ہے۔

آج جب میں ان کے بیٹے کی خواہش پر ان کی تعزیتی کتاب کے لئے تاثرات قلمبند کرا رہا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کہاں سے شروع کروں اور مولانا مرحوم کی کون سی خصوصیت وخوبی کا ذکر کروں کہ ظاہری طور پر کرتا پائجامہ ٹوپی اور شیروانی میں ملبوس عمامہ عبا قبا سے عاری ایک عام سا شخص نظر آنے والا انسان بلندی کردار کی جس منزل پر فائز تھا اس کا احساس وادراک ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ۔

غالباً اب سے کوئی چالیس برس قبل کی بات ہوگی جب مولانا مرحوم جیکب لائنز کے ایک جھونپڑی نما مکان میں رہائش پذیر تھے ۔ قائد ملت جعفریہ جعفر حسین مرحوم سے ان کی آشنائی تقسیم برصغیر سے پہلے سے تھی

علم کے لحاظ سے ان دونوں میں فرق ہو تو ہو لیکن ملنے ملانے اور شخصی روابط میں دونوں میں مجھے چنداں فرق کبھی محسوس نہیں ہوا۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا غرض ہر کام بالکل جگری یار دوستوں کی طرح انجام پاتا۔ قدردانی کا جذبہ مفتی صاحب مرحوم میں کچھ کم نہ تھا چنانچہ وہ بھی اپنے اس عزیز دوست پر جان چھڑکتے تھے۔

مفتی صاحب مرحوم کو سیر سپاٹے کا جنون کی حد تک شوق تھا جب بھی موقعہ ملتا آپ اور میں لمبی سیر پر نکل پڑتے راستے میں مولانا مرحوم کے گھر کے قریب پہنچتے تو ضرور پتہ کرواتے کہ مولانا گھر پر ہیں یا نہیں مجھے یاد ہے کہ کبھی کوئی موقعہ ایسا نہیں آیا کہ مولانا گھر پر موجود ہوں اور آپ نے فی الفور سیر پر نکل جانے پر آمادگی ظاہر نہ کی ہو کون نہیں جانتا کہ گھر پر آدمی کو نہ جانے کتنی قسم کی مصروفیات ہوتی ہیں اور وہ بروقت گھر سے باہر نکلنے کا متحمل نہیں ہو سکتا لیکن مولانا مرحوم نے مفتی صاحب کی بات پر انکار کرنا سیکھا ہی نہ تھا۔

نیک نیت لوگوں کو اللہ بھی اپنی خاص نعمتیں نوازتا ہے کہاں جمشید روڈ کی وہ جھونپڑی اور کہاں مولانا مرحوم کا موجودہ گھر، گذشتہ دس برس سے اس فقیر کو بھی مولانا مرحوم کے دولتکدے پر حاضری کا شرف حاصل ہوتا رہا یہ صرف مولانا مرحوم کی کوشش ہی تھی جو کراچی میں قیام کے دوران ہر نماز جمعہ مجھے عزیز آباد کی مسجد میں ادا کرنے پر مجبور کرتی، ورنہ یہ فقیر کہاں اور نماز جمعہ کا اہتمام کہاں بہرحال میں نے اور بھائی ناظم نے یہ طریقہ اپنا لیا تھا کہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد مولانا مرحوم کے گھر چلے جاتے اور جب تک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولانا مرحوم کی صحبت میں نہ گزار لیتے واپس نہ آتے۔ مولانا مرحوم بھی انتہائی وضعدار تھے۔ مصروفیت خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو وہ نماز جمعہ کے بعد گھر پر ہمارا انتظار کرتے اور اکثر تو ایسا ہوتا کہ ہم مسجد

سے ہی ان کے ساتھ ہولیتے اور پھر مولانا مرحوم کے دولتکدہ پر پرانی باتیں اور یادیں چھڑ جاتیں کبھی مفتی صاحب کے تذکرے ہوتے کبھی قومیات پر گفتگو اس دوران خاطر مدارات کا سلسلہ بھی جاری رہتا ، اب آخری ایام میں جب مولانا مرحوم کی طبیعت زیادہ ناساز رہنے لگی تھی تو دوران گفتگو ان کے چہرے سے کرب کے آثار ظاہر ہوتے تھے لیکن جب تک دل بھر کر بات چیت نہ ہوجاتی ہمیں رخصت کی اجازت نہ دیتے۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے بیٹھک میں بیٹھے ہوئے ہم لوگ مصروف گفتگو تھے میں نے یوں ہی باتوں باتوں میں مولانا مرحوم سے فرش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ مولانا اس فرش پر کوئی قالین وغیرہ ڈلوائیے یوں یہ کورا فرش اچھا نہیں لگتا اور اگر اپنے لیے نہیں تو ہماری خوشی کے لئے ایسا ضرور کیجئے فرمانے لگے جب گنجائش ہوئی تو ایسا ضرور کروں گا۔ میں مولانا مرحوم کے مزاج سے واقف تھا لہذا میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ مال سادات سے یہ فقیر رقم مہیا کرنے کیلئے تیار ہے تو آپ نے انکار کیا میں نے دوبارہ عرض کی کہ اگر مال سادات پر اعتراض ہے تو مال امام سے اس کا بندوبست ہوسکتا ہے لیکن جواب میں اور شدت سے انکار کیا تو میں اپنا سا منہ لیکر خاموش ہوگیا جیسا میں نے پہلے کہا کہ خدا تعالیٰ نیک نیتی اور سچے جذبے رکھنے والوں کا ضرور ساتھ دیتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا اس قادر مطلق کی درگاہ سے کوئی بہتر انتظام ہوا ہوگا جو اس جگہ آج نہ صرف یہ کہ قالین بلکہ ایک دو اور لوازمات بھی موجود ہیں ۔

مولانا مرحوم سادگی کے پیکر تھے ، عمامہ ، قبا اور عبا کبھی نہ پہنی ، کرتا پائجامہ اور شیروانی زیب تن کرتے ، جس کے بٹن گرمی میں کچھ کھلے رہتے ، ریاکاری سے کوسوں دور تھے یہی سبب تھا کہ نہ کبھی آپ کے ہاتھ میں تسبیح گردش کرتی ہوئی دکھائی دی اور نہ ہی لمحہ بہ لمحہ لوٹے اور آفتابہ

کے حاجت مند رہے ، لیکن شرافت اور پاکیزگیٔ نفس کے وہ تمام جوہر جو پروردگار عالم اور ائمہ معصومینؑ کی بارگاہ میں قدرو قیمت رکھتے ہوں آپ کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھے۔

یہاں مولانا مرحوم کی ایک اور خصوصیت کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ آپ کی تحریری اور تقریری صلاحیت تھی ، عموماً لوگ اور مقررین بڑی مرصع اور شاندار تقاریر کرلیتے ہیں اور کرتے ہیں لیکن در حقیقت اس کے لیے اچھی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے لیکن میں بذات خود اس بات کا شاہد ہوں کہ مولانا مرحوم نے بارہا مواقع پر فی البدیہ تقاریر کے ذریعے نہ صرف یہ کہ اپنا نکتہ نظر لوگوں سے تسلیم کرایا بلکہ لوگ آپ کی تقریری صلاحیتوں کے بھی معترف ہوگئے۔ میں نے مولانا مرحوم کے دیگر مضامین کے علاوہ امام جعفر صادقؑ سے متعلق ایک مقالہ بھی پڑھا اور ان تحریروں میں مجھے سلاست زبان کی روانی اور علمی معیار وہی نظر آیا جو ایک انشاء پرداز اور عالم کی تحریر میں ہونا چاہیئے۔

مختصر یہ کہ مولانا مرحوم ایک بڑے عالم ہی نہیں بلکہ بہت بڑے انسان تھے کہ مولانا اور عالم بننا آسان ہے جب کہ ایک اچھا انسان ہونا یقیناً مشکل ہے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیئے

ایک باضمیر انسان

پروفیسر سردار نقوی (امروہوی)

مولانا عنایت حسین جلالوی موجودہ بے ضمیر معاشرہ کے ایک باضمیر فرد تھے ، ایک ایسے عہد میں جب معاشرہ اخلاقی اقدار کے انتشار اور زوال کا شکار ہے ان کی زندگی اقدار کی پاسداری کا نمونہ تھی ، زمانہ اور حالات کا جبر انسان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ زمانے کی رفتار کے ساتھ قدم ملا کر چلے لیکن اعلیٰ انسانی اقدار کی محبت اس سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ زمانے کے جبر کے مقابلہ میں مقاومت کی راہ اختیار کرے ، بقول اقبالؒ

حدیث غیر سکھاتی ہے با زمانہ بساز
زمانہ باتو نسازد تو زمانہ ستیز

زمانے سے یہ مبارزہ بجائے خود ایک جہاد ہے اور مولانا عنایت حسین جلالوی (مرحوم) کی زندگی اس جہاد کا نمونہ تھی ، انہوں نے زمانے کے جبر کو قبول کرنے کی بجائے اصولوں کی پاسداری کا راستہ اختیار کیا ، اس کشمکش میں انہیں کس قدر کامیابی ہوئی اس بحث ونزاع سے قطعِ نظر اتنی بات تو طے ہے کہ زمانہ انہیں ان کے اصولی راستہ سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہوسکا

شکست وفتح تو قسمت سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مولانا عنایت حسین جلالوی کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی ، وہ ایک عالم تھے ، مقرر وخطیب تھے ، معلم ومدرس تھے ، قومی کارکن تھے ، لیکن ان

تمام پہلوؤں اور جہات میں جو بات قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ ان کا اخلاص اور اصول پسندی ہے ، یہی وہ جوہر تھا جس نے ان کی شخصیت کی مختلف جہات میں ہم آہنگی اور وحدت پیدا کی تھی ، ان کی شخصیت اس انسانی شرافت کا نمونہ تھی جس کو دیکھ کر انسانیت پر اعتبار واعتماد میں اضافہ ہوتا ہے ، بقول جوش ملیح آبادی

بہت جی خوش ہوا اے ہمنشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

افسوس کہ اگلی شرافت کے یہ نمونے ایک ایک کرکے رخصت ہوتے جارہے ہیں ، ابھی چند ماہ قبل ڈاکٹر سید ندیم الحسن نقوی اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے اب مولانا عنایت حسین نے ملک عدم کا سفر اختیار کیا ، یہ دونوں افراد اس آفت زدہ قوم کا سرمایہ تھے جو اپنے ہی ملک میں اپنی بقاء کی جنگ لڑنے پر مجبور کر دی گئی ہے ، قیام پاکستان میں شیعیان علیؑ کا کردار ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار خود اپنی جہالت کا اقرار ہے ، محترمی جناب محمود الحسن رضوی نے اس موضوع پر متعدد تحقیقی مضامین کے علاوہ ایک ضخیم کتاب تحریر کی ہے ، لیکن لوگ اس تاریخی حقیقت کا انکار کرکے جہل اور تعصب کی ایک ایسی تاریخ رقم کررہے ہیں جس کا انجام افسوسناک عبرت کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

مولانا عنایت حسین ، ڈاکٹر ندیم الحسن ، جناب محمود الحسن رضوی اور ان کے رفقاء کی مخلصانہ اور تعمیری مساعی کا ایک مظہر مجلس ملی ہے ، اس مجلس کے تحت چند نہایت مفید اور معتبر کتابیں شائع کی گئی ہیں جن میں میر انیس کے شاہکار مرثیہ ، یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر ، کا انگریزی ترجمہ بھی شامل ہے ، یہ ترجمہ پروفیسر غلام عباس نے کیا ہے جو ایک ماہر تعلیم ، ادیب اور مترجم کی حیثیت سے معروف و مشہور ہیں اسی ادارہ یعنی مجلس ملی

کے زیر اہتمام حضرت امام جعفر صادقؑ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیئے ہر سال ایک علمی مجلس (سیمینار) منعقد ہوتا تھا جس میں علماء ، دانشور ، ادیب اور شاعر امام علیہ السلام کے علمی فیوض پر اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے ، مولانا عنایت حسین یہ تمام خدمات نہایت خلوص اور خاموشی سے انجام دیتے رہے ، انہیں نہ کسی ستائش کی تمنا تھی اور نہ وہ کسی صلہ کی پرواہ کرتے تھے ، انہوں نے اپنی ذاتی شہرت کے لیئے نہ کوئی لابی بنائی نہ کوئی گروپ تشکیل دیا نہ کسی سرمایہ دار سے کوئی رقم لی نہ کسی سیاسی جماعت یا حکومت سے کوئی سودا کیا ، وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے اور قدرت نے انہیں جو کچھ صلاحیتیں دی تھیں ان تمام صلاحیتوں کو بہترین طریقہ پر خدا کے دین کی خدمت کے لیئے استعمال کرتے رہے ۔

میری اس تحریر سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ مولانا مرحوم کو دین کی خدمت کے جذبہ نے ان کی معاشی ذمہ داریوں سے یکسر غافل بنا دیا تھا ، نہیں ! ان کی زندگی عدم توازن کا شکار نہیں تھی ، ان کی معاشرتی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ان کی وہ ملازمت تھی جس کے فرائض وہ بخوبی انجام دیتے رہے ، وہ دولت کی ضرورت سے بے نیاز نہیں تھے لیکن وہ دولت کی ہوس میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے ، وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ رزق حلال کی تلاش دراصل اللہ تعالیٰ کے فضل کی تلاش ہے ، لیکن دولت کی ہوس وہ خرابی ہے جو اخلاق وکردار کی تمام خوبیوں کو ضائع کردیتی ہے ، مولانا کا دل دولت کی ہوس سے پاک تھا اس لیئے انہوں نے اپنے علم کو مال تجارت نہیں بنایا بلکہ وسیلۂ خدمت قرار دیا اس کا نتیجہ ہے کہ وہ صرف عالم نہیں تھے بلکہ عالمِ باعمل تھے ، ان کی شخصیت کا باطن علم تھا اور ظاہر تقویٰ اور وہ معاشرے میں عدل واحسان کے فروغ کے لیئے کوشاں رہے۔

موت نے مولانا عنایت حسین جلالوی مرحوم کی زندگی کا چراغ گل کر دیا لیکن ان کی یادوں کے چراغ ان کے چاہنے والوں کے دل میں فروزاں رہیں گے ، ان کی یاد ایک ایسے انسان کی یاد ہے جو انسانی شرافت کا نمونہ تھا ، مرحوم نے مفاد پرستی کی بجائے انسانی اقدار کے تحفظ کا شعار اپنایا اور اپنے اصولوں کو کبھی مصلحت کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھایا ، انہوں نے اپنی زندگی کے لیئے علم اور تقویٰ کی جس راہ کا انتخاب کیا تھا وہ اس راہ پر گامزن رہنے میں کامیاب رہے ، میرے خیال میں کسی انسان کی کامیابی کی اس سے بڑی کوئی اور سند نہیں ہو سکتی ،

پروردگار عالم معصومین علیہم السلام کے طفیل وتصدق میں مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

پیارا دوست

سید عالم الرضوی

سچی دوستی کے معیار پر پورا اترنے والا دوست کسی انسان کو دنیا میں بڑی مشکل سے ملتا ہے۔

اے دوست کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا وخضر سے

میرے دائرہ احباب میں چند ایسے دوستوں میں خلد آشیاں سید عنایت حسین کا نام سرفہرست ہے۔ آہ ۔۔۔۔ آج عنایت حسین کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم کا دل میرے دل کے ساتھ لرز رہا ہے۔ کل بزم احباب کو زعفران زار بنانے والا یہ باغ وبہار انسان ہماری نگاہوں سے بظاہر اوجھل ہے لیکن درحقیقت ہمارے دل کی بستی میں آج بھی ضیا پاشیاں کر رہا ہے مولانا عنایت حسین ایک پیکر کا نام نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت شخصیت اور ایک فعال ادارے کا نام ہے جو مسند درس پر ایک شفیق استاد قومی پلیٹ فارم پر ایک شعلہ بیاں مقرر وخطیب میدان صحافت میں ایک کامیاب شہسوار ہونے کے علاوہ علمی بلندیوں پر فائز ہونے کے باوجود انتہائی خلیق اور منکسر المزاج حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مردم خیز خطہ قصبہ جلالی ضلع علیگڑھ میں اب سے تقریباً ستر سال قبل پیدا ہونے والی یہ شخصیت اودھ کی راجدھانی لکھنو کے عظیم علمی مرکز مدرسۂ ناظمیہ سے ممتاز الافاضل کی اعلیٰ سند حاصل کرکے قوم کی مذہبی خدمات میں منہمک رہی۔

قیام پاکستان کے بعد ہجرت کرکے مولانا عنایت حسین بھی دیگر

دانشوروں کے ہمراہ وارد کراچی ہوئے اور مہاجرین کے اس مرکزی شہر میں متعدد قومی اداروں کی رکنیت قبول کی ان تنظیموں میں ادارہ تحفظ حقوق شیعہ بھی شامل ہے اس ملک گیر ادارے کے بنیادی رکن اور روح رواں رہے اور بعد میں شیعہ مطالبات کمیٹی میں خطیب اعظم مولانا سید محمد صاحب دہلوی کے شانہ بشانہ دیگر کارکنوں کے ساتھ مولانا عنایت حسین بھی نمایاں خدمات انجام دیتے رہے ۔

آہ ۔۔۔۔ جگری دوست عنایت حسین کی عنایتوں کی یاد آج بھی دل کی دنیا میں ہلچل مچائے ہوئے ہے ۔

آہ ۔۔۔۔ افسوس رفتہ رفتہ سارے سنگی ساتھی بچھڑ گئے ان بچھڑنے والوں میں شعلہ بیاں شاعر شیون رضوی قومی انجمن پنجتنی کے جنرل سکریٹری سید محمد مقصود زماں اکبر آبادی ، عظیم حسینی شاعر حضرت فضل لکھنوی اور میرے عزیز ترین شاگرد آثم اکبر آبادی کے بعد مجھے اپنے قابل احترام دوست مولانا سید عنایت حسین جلالوی کا داغ مفارقت برداشت کرنا پڑا بقول جوش ملیح آبادی ہم نے سب کا غم اٹھایا ہمارا غم اٹھانے والا کوئی سچا دوست نہ رہا ۔

مولانا جلالوی اور حسینی اسکول

کل کی بات ہے کہ کراچی کی معروف درسگاہ حسینی بوائز سیکنڈری اسکول میں ۱۹۵۸ ء میں بحیثیت معلم عربی وفارسی میرا اور میرے دوست کا ایک ساتھ تقرر ہوا تھا ۔ ۵۸ ء سے قبل حسینی اسکول کی جدیدنو تعمیرشدہ عمارت کی افتتاحی تقریب میں بانی اسکول نے اس وقت کے صدر مملکت غلام محمد صاحب کو مدعو کیا تھا آبائی تعلقات کی بنا پر بانی اسکول علامہ سید محمد رضی آل نجم العلماء نے اس تقریب میں شرکت کے لئے میرے اور مولانا

جلالوی کے نام بھی دعوت نامہ بھیجا تھا میں ۱۹۵۸ء میں سٹی ہائی اسکول میں تدریسی خدمات انجام دے رہا تھا اس تقریب کے اختتام پر علامہ سید محمد رضی صاحب مجتہد نے بصد خلوص فرمایا غیروں کی درسگا کو کامیاب بنانے میں آپ اپنی علمی صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں ۔ آپکی اپنی درسگاہ (حسینی اسکول) بحمد اللہ اب اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ اس کی بنیادیں بفضل الہیٰ مستحکم ہیں آپ حسینی اسکول کو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہنچائیں ۔ میں نے جواباً عرض کیا ۔ قبلہ ! آپ کی توجہ کا شکریہ ۔ لیکن میں گزشتہ دس سال سے سٹی ہائی اسکول میں تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہوں ۔ البتہ از روئے ضابطہ سٹی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو ایک ماہ کا نوٹس دے کر اس مدت کے بعد حاضر ہو سکوں گا ۔ چنانچہ میں نے دوسرے دن استعفیٰ پیش کر دیا ۔ جب میں حسینی اسکول پہنچا تو یہاں دیگر احباب کے علاوہ اپنے مخلص دوست مولانا عنایت حسین سے بھی ملاقات ہوئی دوران گفتگو یہ راز فاش ہوا کہ ہمارے پیارے دوست بھی اسی زمرہ میں حسینی اسکول آئے ہیں ۔ باتوں باتوں میں یہ جملہ زبان پر آگیا کہ " خوب گزرے گی جو مل بیٹھے گے دیوانے دو " ۔

المختصر ۵۸ ء سے قبل تو اپنے دوست سے وقفہ وقفہ سے ملاقات ہوا کرتی تھی لیکن حسینی اسکول کی وجہ سے ملاقاتوں کا حسیں تسلسل تقریباً ۱۵ سال تک جاری رہا ۔

ابھی ہم دونوں کو حسینی اسکول کے ماحول میں چند ماہ ہی گزرے تھے کہ جناب علامہ سید محمد رضی قبلہ (صدر آل پاکستان حسینی ایجوکیشنل سوسائٹی) نے کراچی کے علاوہ اندرون سندھ بھی سوسائٹی کی چند درس گاہیں قائم کرنے کا پروگرام بنایا اور اس ضمن میں مجھے حسینی ایجوکیشنل سوسائٹی سندھ کے آنریری سکریٹری کے منصب کے ساتھ لاڑکانہ جانے کے لئے کہا اور

میں دوسرے دن لاڑکانہ روانہ ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر میں نے شہری ماحول کا جائزہ لیا اور اپنے برادر حضرت معصوم الرضوی سے لاڑکانہ میں حسینی اسکول کے قیام کے بارے میں تبادلہ خیال کیا بھائی صاحب کے ایک عزیز دوست پروفیسر عسکری حسین ذاکر اہلبیت بھی اس مشورے میں شامل تھے طے پایا کہ اس تحریک کے لئے ایک مختصر جلسہ منعقد کیا جائے اس تجویز کے تحت احباب کی ایک نشست ہوئی اور اس کے بعد اس سلسلے میں کئی جلسے منعقد ہوئے ۳ ۔ ۴ ماہ کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ قاضی فضل اللہ صاحب سے رابطہ قائم کرکے اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا جائے ۔ چنانچہ پروفیسر عسکری حسین کے ذریعہ یہ تجویز وزیر اعلیٰ تک پہنچی اور موصوف نے تعاون کا وعدہ کیا بعد ازاں راقم الحروف نے لاڑکانہ کی قومی انجمنوں کے نمائندوں کی دستخطوں سے ایک پوسٹر شائع کیا جس میں حسینی اسکول کے قیام کا اعلان کیا گیا اس کے بعد میں نے مدیر اخبار ریاست سکھر کے زیر اہتمام ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آل پاکستان حسینی ایجوکیشنل سوسائٹی (کراچی) نے لاڑکانہ کے علم دوست طبقہ کے تعاون سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ لاڑکانہ شہر میں ایک درس گاہ حسینی اسکول کے نام سے قائم کی جائے جس کے نظم ونسق کے لئے مقامی سربرآوردہ حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دی گئی ہے اس کمیٹی کو وزیر اعلیٰ سندھ کا تعاون حاصل ہے ۔ آئندہ ماہ اس اسکول کا افتتاح ہوگا اور آئندہ ہفتہ اسکول کی مجلس منتظمہ نے تاریخ افتتاح کا اعلان کر دیا ۔ میں نے اس کاروائی کی حضرت علامہ محمد رضی صاحب قبلہ کو اطلاع دیتے ہوئے ان سے گزارش کی کہ آنجناب مقررہ تاریخ پر لاڑکانہ تشریف لاکر اہالیان شہر کو اعزاز بخشیں ۔

حضرت علامہ تاریخ پر معہ اپنے اسٹاف اور حسینی اسکول کراچی کے اسکاؤٹ دستہ کے جب لاڑکانہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو سینکڑوں قومی رضا کاروں اور معززین شہر نے شاندار استقبال کیا۔ حضرت علامہ کے ہمراہیوں میں حسینی ایجوکیشنل سوسائٹی کے جنرل سکریٹری پروفیسر احسن فاروقی (ایم اے۔پی ایچ ڈی) اور خطیب اہلبیت مولانا سید عنایت حسین جلالوی بھی تھے جن کا تعارف معززین شہر سے حضرت علامہ نے خصوصی طور پر کرایا۔

دوسرے روز وزیراعلیٰ سندھ سے رابطہ قائم کرکے لاڑکانہ میں حسینی اسکول کے افتتاح کا دعوت نامہ پیش کیا اور حضرت علامہ کے دورہ لاڑکانہ کی اطلاع دی گئی قاضی فضل اللہ وزیر اعلی سندھ نے خیرسگالی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے علامہ محمد رضی صاحب اور ان کے ہمراہیوں کے اعزاز میں ظہرانہ کا اہتمام کیا اور یہ دعوت نامہ راقم الحروف کے نام پروفیسر عسکری حسین کے ذریعہ وصول ہوا۔ مقررہ وقت پر ہم لوگ اس ظہرانے میں شرکت کے لئے پہنچے تو وزیر اعلیٰ نے پرتپاک خیر مقدم کیا اور لاڑکانہ میں حسینی اسکول قائم کرنے کے ضمن میں پورے تعاون کی یقین دہانی کرائی اور اختتام ظہرانہ پر لاڑکانہ کے میئر عبدالغفور بھرگڑی کو حکم دیا کہ حسینی اسکول کے لئے موزوں جگہ فراہم کی جائے چنانچہ اس کے بعد اسکول کا افتتاح اس زمانہ کی غیر متنازعہ نوجوان، تعلیم یافتہ شخصیت جناب ذوالفقار علی بھٹو سے کرایا گیا۔

جناب علامہ سید محمد رضی صاحب اور مولانا سید عنایت حسین صاحب کی تقاریر کو علم دوست طبقہ نے بے حد سراہا۔ چونکہ مولانا جلالوی حسینی اسکول کراچی کے میگزین "ماہنامہ ساحل" کے ایڈیٹر تھے اس لئے بحیثیت صحافی بھی ارباب دانش نے ان کا بڑا احترام کیا اردو داں اہل ادب نے ماہنامہ ساحل کی خریداری منظور فرمائی۔ مولانا جلالوی اپنے باغ وبہار

مزاج سے علمی محفلوں کو زعفران زار بناتے رہے چار روز قیام کے بعد حضرت علامہ اور مولانا جلالوی اور ڈاکٹر احسن فاروقی اہل لاڑکانہ کی پرتکلف ضیافت سے محظوظ ہونے کے بعد اپنے دیگر ہمراہیان کے ساتھ کراچی واپس آگئے۔ حسینی اسکول (کراچی) کے اسٹاف میں مولانا جلالوی کی شخصیت ایک ممتاز حیثیت کی مالک رہی ۔ درس وتدریس سے ہٹ کر میں نے ۷۱ ۔ ۷۰ء میں مولانا جلالوی کو ایک نیم سیاسی ڈگر پر ڈالنے کی کوشش کی اور ایک نیم سیاسی جماعت مہاجر عوامی پارٹی (جس کا میں جنرل سکریٹری اور جناب پرنس عباس مرزا صدر تھے کے اسٹیج پر آنے کی دعوت دی میرے دوست نے یہ دعوت قبول کرلی اور اپنی شعلہ بیانی سے حاضرین جلسہ کو مسحور کرلیا۔

یوم حسینؑ

حسینی اسکول میں ۳ شعبان کو ہر سال یوم حسینؑ منایا جاتا تھا اور اس تہنیتی تقریب میں اسکول کے طلبا واساتذہ کے علاوہ ممتاز شعراء و ادبا ودانشور شرکت فرماتے ۔ یہ سالانہ اجتماع بزم ادب کے زیر اہتمام ہوا کرتا تھا اور راقم الحروف بزم ادب کا نگراں تھا طلبا کی تقاریر کی تیاری اور نظموں کا انتخاب ہم دونوں دوستوں کی مشترکہ ذمہ داری تھی مولوی عنایت حسین خصوصی توجہ فرماتے تھے اس اجلاس میں بہترین ۳ مقرر طلبا اور ۳ نظم خواں طالب علموں کو انعامات دئے جاتے تھے مولانا جلالوی شاعر تو نہ تھے لیکن صاحب شعور نقاد کی حیثیت سے میری نظموں کی داد دل کھول کر دیتے تھے ۔ حسینی اسکول میں تقریباً ۱۵ سال سروس کے بعد پریمیر کالج میں اسلامیات کے لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوگیا اور چارج سنبھال لیا اس لحاظ سے یومیہ ملاقات کا سلسلہ تو منقطع ہوگیا لیکن وقفہ وقفہ سے ہم دونوں ملتے رہے ۔

ایک کامیاب خطیب

ایک شفیق معلم کے علاوہ آپ ایک کامیاب ذاکر وخطیب کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے تھے کراچی میں تقریباً چالیس سال خطابت کے فرائض انجام دینے کے علاوہ بیرون ملک بھی مجالس سے خطاب کرنے کے لئے جاتے رہے ۔ اب چند سال سے امراض قلب کے باعث بے حد کمزوری لاحق ہو گئی تھی جس کی وجہ سے مجلسیں نہیں پڑھتے تھے۔ ایسا مخلص خطیب کراچی کی وسیع آبادی میں اب نظر نہیں آتا جس نے اپنی خطابت کو تجارت کے سانچے میں نہ ڈھالا ہو ، ایسے شریف النفس ذاکر اہلبیتؑ کی مثال آج مشکل ہی سے ملے گی جو بلا عذر وبلا تکلف بانی مجلس کی دعوت کو قبول کرلے ذکر حسینؑ سے والہانہ عشق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بعض اوقات کوئی معروف ذاکر بوجوہ بروقت مجلس میں نہیں پہنچ سکا تو مولانا جلالوی کے مزاج شناس افراد بانی مجلس کو فی الفور یہ مشورہ دیتے کہ مولانا کے پاس جاؤ اور ان سے اس صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے خطابت کی درخواست کرو امید ہے تمہاری یہ مشکل آسان ہوجائے گی اور ایسا ہوتا بھی تھا کہ ایسے نازک وقت میں بانی مجلس کی مدد کرتے اور فوری طور پر مجلس میں پہنچ کر منبر نشین ہوتے ۔ اس انداز خطابت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا جلالوی فن خطابت پر کس درجہ عبور رکھتے تھے۔

اس منزل پر میں اپنی قوم کے پہلی صف کے بعض ذاکرین کی روش کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں ۔

قیام پاکستان کے بعد جہاں ہر شعبہ حیات میں انقلاب آیا وہاں ذاکروں اور خطیبوں کے مزاج بھی انقلاب کی زد میں آئے پر خلوص بانیان مجلس شاہانہ نذرانہ کے مطالبہ سے آٹھ آٹھ آنسو رو رہے ہیں اور بے ساختہ

جوش کی نظم ذاکر سے خطاب کا یہ الم انگیز مصرع ۔

خون اہلبیتؑ سے لقمہ کو تر کرتا ہے تو

زبان پر آجاتا ہے ۔

رکھنا غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس درد دل کے اظہار سے کسی منبر نشیں کی اہانت خدانخواستہ میرا مقصد ہرگز نہیں ۔

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

منبر رسولؐ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہر ذاکر اہلبیتؑ کی منزلت میری نگاہوں میں ہے، درحقیقت ہماری قوم کا ہر خطیب بے لوث مذہبی خدمات انجام دیتا ہے صرف چند حضرات منبر نشینی سے ناجائز استفادہ کر رہے ہیں۔ ان کی بارگاہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں ۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

بحیثیت مقالہ نگار

۱۹۸۵ء میں ادارہ سجادیہ (کورنگی کراچی) کے سربراہ کی حیثیت سے راقم الحروف کا انتخاب ہوا تو میں نے پہلے اجلاس میں ارکان ادارہ کو قلمی خدمت کی جانب متوجہ کیا اور یہ طے پایا کہ امسال ایام عزا سے قبل ایک کتاب حضرت ابو طالبؑ کے سوانح حیات پر مشتمل شائع کی جائے جس میں

مستند اہل قلم کے مقالات پیش کئے جائیں اس کتاب کا نام " محسن قریش " طے پایا چنانچہ اس کی ترتیب و تدوین کے فرائض راقم الحروف نے دو ماہ کے عرصہ میں انجام دیئے " محسن قریش " میں آیت اللہ علامہ سید علی نقی مجتہد علامہ محمد حسین زیدی مفسر قرآن حجتہ الاسلام مولانا سید فاضل حسین موسوی ، علامہ ذیشان حیدر جوادی کے علاوہ علامہ سید عنایت حسین جلالوی کا پر مغز مقالہ بھی شامل ہے اس مقالے کے لئے میں نے اپنے دوست سے خصوصی طور پر درخواست کی موصوف نے اپنی علالت کا عذر پیش کیا لیکن میں کب ماننے والا تھا میرے اصرار پر مولانا نے ایک بسیط مقالہ پیش کرنے کا وعدہ کرلیا اور یہ علمی مضمون آج بھی ان کی کاوش قلم کی منہ بولتی تصویر ہے ۔

راقم الحروف کے تاثرات

اپنے یہ تاثرات اپنے دوست کے لائق فرزند اکبر عزیزی مصدق سلمہ کے حسب خواہش قلم برداشتہ ضابطۂ تحریر میں آئے ہیں بنا بر ایں اس میں عبارت آرائی کو مطلق دخل نہیں ہے ۔ مجھے طوالت تحریر کا احساس ہے لیکن میں کیا کروں ۔

" آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی "

اے میرے پیارے دوست ! تو نے تمام عمر بزم احباب میں گہر افشانیاں کیں ۔

" آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے "

مرد قلندر ۔ ہمہ اوصاف ویگانہ

سید اشتیاق حسین
مدیر ماھنامہ الامیر کراچی

موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کا انکار کسی ذی حس کے لئے ممکن نہیں ۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا یقین رکھنے کے باوجود لوگ دنیاداری اور " حبِ دنیا " میں اس قدر محور ہوجاتے ہیں کہ وہ جائزوناجائز کو یکسر اس طرح نظر انداز کردیتے ہیں جیسے انہیں مستقلاً اسی دنیا میں رہنا ہے اور یہیں کی آسائشات سے ہمیشہ ہمیشہ مستفید ہونا ہے لیکن ہوتا وہی ہے کہ جو کاتبِ تقدیر نے لکھ رکھا ہے کہ وہ تمام تر نعمات دنیوی کے حصول کے بعد اس سے کماحقہ فائدہ بھی نہیں اٹھا پاتے کہ موت کا پنجہ انہیں اپنی گرفت میں لے کر چشمِ زدن میں ان کی شمع حیات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل کر دیتا ہے اور وہ دولت و حشمت جس کے حصول کے لئے انہوں نے بڑی تگ ودو بلکہ جبر وظلم سے کام لینے سے بھی گریز نہیں کیا تھا آناً فاناً دوسروں کے قبضے میں چلی جاتی ہے جو بڑی بے دردی اور بے رحمی سے اسے اڑا دیتے ہیں ۔

لیکن دنیا ایسے لوگوں کے وجود سے بھی خالی نہیں جو ناپائیداری عالم پر یقین رکھتے ہوئے اپنی زندی بڑی احتیاط سے گذارتے ہیں ۔ مادی وسائل اور حصول رزق کے لئے بس اتنی ہی جدوجہد کرتے ہیں جو انہیں سفید پوشی سے زندگی گذارنے کے لئے کافی ہو اور اپنا تمام وقت بندگان خدا کی بہبود اور معاشرے کی اصلاح کے لئے صرف کردیتے ہیں ۔ ایسے لوگ اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کے مفاد کو اہمیت دیتے ہیں اور انہیں سکون و استراحت اسی

میں حاصل ہوتی ہے کہ وہ کسی ضرورتمند کے کام آسکیں ۔

مولانا سید عنایت حسین جلالوی مرحوم ، جو کل ہمارے درمیان موجود تھے آج منوں مٹی کے نیچے محو خواب ہیں لیکن ان کی خوشگوار یادیں ، ان کی سادگی ان کا ایثار اور دوسروں کی حاجت براری کا ان کا بے مثال جذبہ ان کے عزیزوں ، دوستوں اور ان کے ملنے والوں کے دلوں میں ہمیشہ ہمیشہ اس طرح جاگزیں رہے گا کہ جیسے وہ زندہ وسلامت ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہماری رہنمائی و مطلب براری کے لئے آمادہ وتیار ہیں ۔

مولانا کی وضع قطع ، لباس ، غذا اور طریقہ بودوباش میں بڑی سادگی تھی ۔ قیمتی لباس ، اعلیٰ ومرغن غذائیں ، پر تعیش اور شاندار رہائش اور عمدہ فرنیچر جیسی چیزوں کا انہیں مطلق شوق نہ تھا ۔ کراچی جیسے عروس البلاد میں رہتے ہوئے سادہ معاشرت کو اختیار کرنا ان جیسے بلند وبا کردار شخص ہی کا کام تھا ۔ ان کے لاتعداد شاگرد اور ان سے بہت کم علمی استعداد رکھنے والے افراد جس شان وشوکت اور ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے اور ان کے پاس دولت کی جو ریل پیل تھی ، مولانا سید عنایت حسین پر اس کا کوئی اثر نہ تھا ۔ پوری طاقت وصلاحیت رکھنے کے باوجود مولانا دنیاوی جاہ وجلال کے حصول سے بے پروا اور اپنی عزت نشینی میں مگن تھے۔

خاندانی اعتبار سے مولانا ایک زمیندار خاندان کے فرد تھے اور ان کے آباؤ اجداد علی گڑھ کے قریب قصبہ جلالی میں بڑے اثرورسوخ کے مالک تھے لیکن مولانا عنایت حسین میں فقرودرویشی بدرجہ کمال تھی اور یہ غالباً ان کے نجیب الطرفین سید ہونے کی دلیل تھی ۔

مولانا مدرسہ ناظمیہ لکھنو کے فارغ التحصیل تھے لیکن پاکستان آنے کے بعد انہوں نے اپنے علم و فضل کو حصول زر کا ذریعہ بنانے سے گریز کیا اور اپنی تمام تر صلاحیتیں ملک وقوم کی سربلندی اور بندگان خدا کی فلاح

وبہبود کے کاموں میں صرف کیں ۔ اپنے اور اپنے اہل وعیال کی گذر بسر کے لئے انہوں نے درس وتدریس کا شغل اختیار کیا اور معمولی مشاہرہ پر پریمئیر کالج اور جامعہ کراچی میں تشنگان علم وادب کو عرصہ دراز تک سیراب کرتے رہے۔

مولانا ایک بلند پایہ خطیب بھی تھے لیکن ان کا مقابلہ کسی پیشہ ور شعلہ بیان مقرر سے نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا نے اپنی خطابت کو آمدنی کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ ان کی یہ صلاحیت دراصل انکے لئے باعث زحمت اور مالی نقصان کا سبب بنی ۔ " زحمت " یوں کہ وقت وناوقت لوگ انہیں بلاتے جسے مولانا اپنی عادت کے مطابق بسرو چشم قبول کرلیتے اور مالی نقصان یوں کہ آمدورفت کا کرایہ بالعموم مولانا اپنی جیب خاص سے ادا کرتے تھے لیکن اس ضمن میں ان کی زبان پر کبھی بھی حرف شکایت نہیں آیا۔ دوست احباب اور ملنے والوں کو البتہ اپنے طور پر قائق کا بخوبی علم تھا ۔

مولانا نے یوں تو بے شمار علمی ، ادبی ، دینی اور سماجی بہبود کے کاموں میں عملی حصہ لیا لیکن آخری زمانے میں انہوں نے خود ایک خالصتاً علمی وادبی ادارہ " مجلس ملی " کے نام سے قائم کیا جس نے خاصا تحقیقی کام کیا اور اعلیٰ پیمانے کے سیمینار بھی منعقد کئے جس کی یاد بہتوں کے ذہن سے ابھی بھی فراموش نہیں ہوئی ۔

مولانا نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ لیاقت آباد کی تنگ وتاریک بستی میں گزارا البتہ جب روشنیوں کے شہر کراچی کو حسد ونفرت نے اپنی آماجگاہ بنالیا اور مختلف عصبیتوں کے عفریت اس شہر کے امن وسکون کو غارت کرنے پر تل گئے تو پھر مولانا کو بھی ہجرت مزید کرنا پڑی اور وہ لیسین آباد کی بستی میں منتقل ہوگئے جہاں زندگی کے بقیہ دن گذار کے ۹ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو وہ اپنی ابدی آرامگاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

کون نہیں جانتا کہ جو پیدا ہوا ہے ایک نہ ایک دن اسے ضرور مرنا ہے لیکن کامیاب ہیں وہ افراد جنہوں نے دنیاوی جھمیلوں میں اپنے آپ کو الجھانے سے گریز کیا اور اپنی زندگی سادگی سے گزار کے عالم آخرت کا سفر اس انداز سے کیا کہ ان کا دامن آلائشوں سے پاک تھا۔ ان کے حقوق دوسرے کے ذمے باقی ہوں تو ہوں ، خود وہ بری الذِّمہ تھے۔ یہ بات پوری طرح مولانا عنایت حسین جلالوی پر صادق آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہے بے شمار افراد ان کے گرویدہ رہے اور جب وہ اپنے سفر آخرت پر روانہ ہوئے تو ایک جمِ غفیر رنجیدہ و سوگوار تھا۔ ان کے جدِ امجد اور مورث اعلیٰ کی بے شمار نصیحتوں میں سے ایک نصیحت یہ بھی ہے کہ زندگی اس طرح گزارو کہ لوگ تمہیں بہت پسند کریں اور جب انتقال کرو تو لوگوں کی کثیر تعداد تمہارا سوگ منائے۔

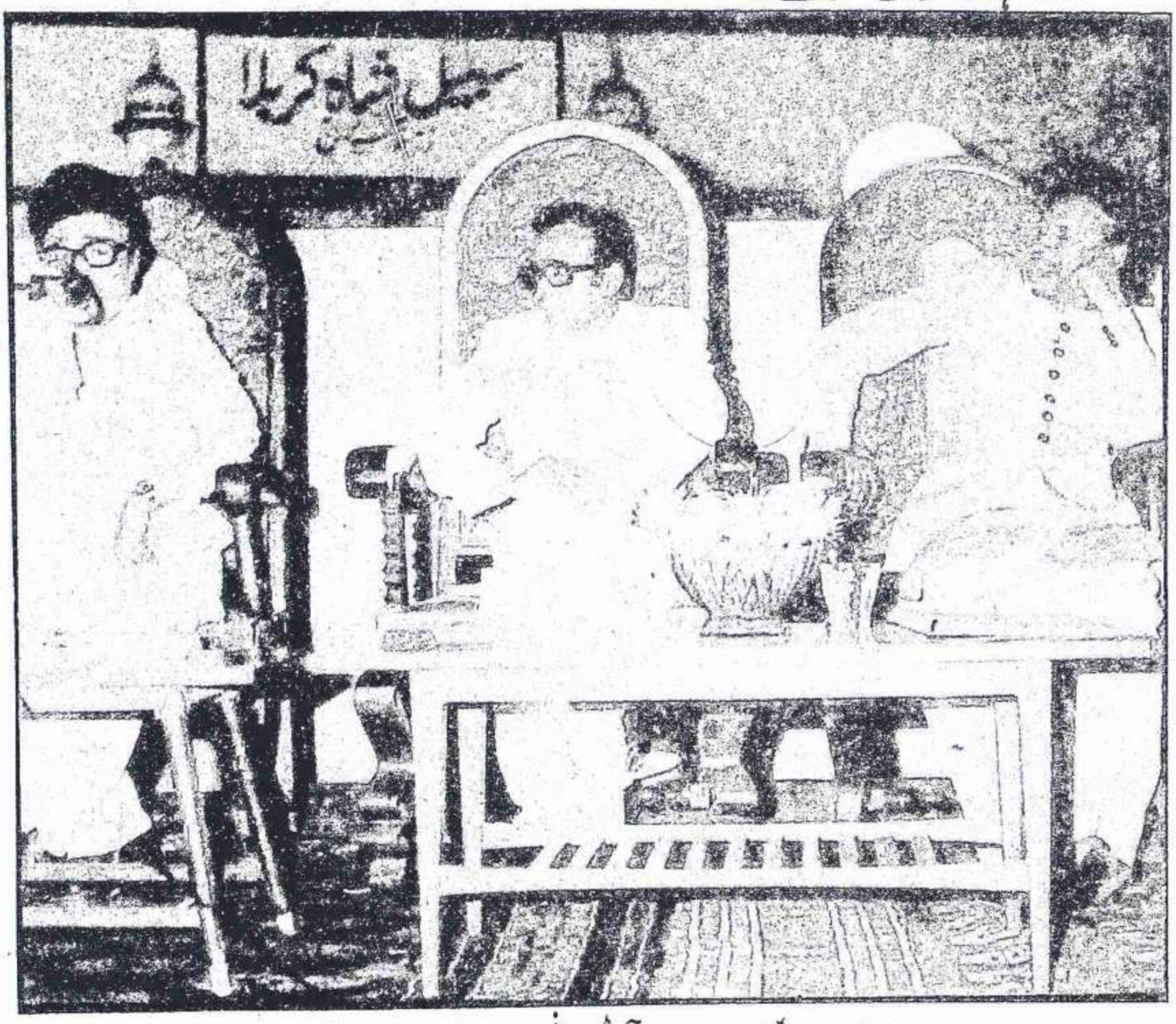

امام جعفر صادقؑ سیمینار میں جسٹس فخرالدین جی ابراہیم کے ہمراہ

پر عزم اور بھرپور زندگی

پروفیسر محمد سیدین زیدی
شعبہ ارضیات جامعہ کراچی

پروفیسر مولانا عنایت حسین جلالوی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۳ء میں ہوئی تھی جب وہ حج کے لئے سعودی عرب تشریف لائے تھے اور جدہ میں مجھے بھی میزبانی کا شرف بخشا تھا گو کہ یہ گیارہ برس پرانا واقعہ ہے لیکن کل کی سی بات لگتی ہے پھر جب میں کراچی منتقل ہوگیا تو ملاقات رہنے لگی در حقیقت میں نے مولانا مرحوم کو بہت تھوڑے دن قریب سے دیکھا لیکن وہ آیا اس نے دیکھا اور اس نے فتح کرلیا کے مصداق مولانا نے بھی پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنا گرویدہ کرلیا اور میں ان کے حلقہ ارادتمندان میں شامل ہوگیا۔ کیا لکھوں کہ ان کی تعریف وستائش کے لئے مجھے مناسب الفاظ کی تلاش ہے جو شاید ناکام ہی رہے۔

میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جلد ہم سے دور چلے جائیں گے، مجلس ملی سے ان کی محبت، دلچسپی اور اس کے پروگرام کے لئے آپ کی محنت شاقہ سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس ادارہ کو مزید ترقی اور عظیم قومی خدمت انجام دینے کے لئے بتائید الہی طویل عمر پائیں گے لیکن روز بروز گرتی ہوئی صحت اور انتہائی تکلیف دہ عارضہ قلب نے ایک انتہائی وضعدار منکسر المزاج، حلیم الطبع، خلیق، ملنسار شخصیت اور قوم وملت کے حقیقی غمخوار کو ہم سے جدا کر دیا۔

ان کی پرلطف وپرمغز ٹھہری ہوئی گفتگو ان کے طرزِ استدلال وطرزِ ابلاغ کی خاص نشانی تھی مجالس بھی وہ بہت سادہ اور سلجھے ہوئے انداز میں

پڑھتے تھے جس طرح طرز زندگی میں کوئی تصنع کوئی بناوٹ نہ تھی بعینہٖ مجالس عزا بھی لفاظی اور ذہنی عیاشی میں مبتلا کرنے کے بجائے پیغام عمل سے بھرپور ، اس دورِ ابتلا میں اب ایسے لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں جو قوم ومذہب سے اسقدر مخلص ہوں جو قوم سے کسی شے کے طلبگار نہ ہوں بلکہ ہر صورت اور ہر قسم کے حالات میں کچھ نہ کچھ قوم ومذہب کی نذر کرنا چاہتے ہوں ، آپ خدمت کرنے کا بے مثل حوصلہ وجذبہ اور عزم صمیم رکھتے تھے۔

زندگی نے جو کچھ مہلت دی اسے خوب اور بہت خوب استعمال کیا۔ ہم میں سے اکثر لوگوں کی زندگی اس فکر وپریشانی اور سوچ بچار میں گزر جاتی ہے کہ زندگی کیسے گزاری جائے مگر مولانا کی انتہائی مستعد متحرک فعال پرعزم اور بھرپور زندگی دیکھ کر تو بس یہی خیال اور خواہش دل میں پیدا ہوتی تھی کہ زندگی گزاری جائے تو ایسے اور اس نہج پر چہ جائیکہ یہ سوچنے ہی میں گزار دی جائے کہ کیا کیا جائے۔

مولانا یقیناً چلے گئے ، کبھی نہ آنے کے لئے ، دور بہت دور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لیکن ان کی زندگی کے انمٹ اور قابلِ تقلید نقوش اہلِ قلب و نظر کو پیروی کی دعوت دے رہے ہیں گو کہ راہ بڑی پرخطر اور خاردار ہے لیکن اس خاردار اور پر خطر راہ پر چلنے اور ثابت قدمی سے چلنے کا جو اجر اور انعام خالق کائنات نے مقرر کیا ہے وہ اس مختصر سی پریشانی اور تکلیف کے مقابلے میں دائمی اور کبھی ختم نہ ہونے والا ہے اور یقیناً مولانا مرحوم اب اسی انعام اور اجر سے مستفید ہو رہے ہیں جس کا سلسلہ اب کبھی ختم نہ ہوگا۔

وہ جو دنیا میں رہے پیکرِ طاہر کی طرح

تحریر :رشید حیدر رضوی
(ٹرسٹی جامعہ امامیہ)

جامعۂ امامیہ کے لئے سال رواں اس لحاظ سے ایک منحوس سال ثابت ہوا کہ اس کے دوران ٹرسٹ کے دو مربی اور محسن متولیان دارِ فانی سے سدھار گئے ۔ ڈاکٹر ندیم الحسن صاحب کی شہادت کا غم دل سے محو نہ ہو پایا تھا کہ عالم باعمل مشہور مفکر ، دانشور ، مدبر ، ذاکر حسینؑ ، ماہرِ تعلیم جناب پروفیسر عنایت حسین جلالوی صاحب مدظلہٗ نے داعی اجل کو لبیک کہا مولانا صاحب جامعۂ امامیہ کے میجنگ ٹرسٹی تھے ان کی وفات حسرت آیات سے ایک ایسی ہستی کا سایہ جامعہ امامیہ کے سر سے اٹھ گیا جس کا مداوا مستقبل قریب میں نظر نہیں آتا۔

جامعہ امامیہ کے حوالے سے مولانا عنایت حسین جلالوی کی رحلت سے جو نقصان ہوا اس کے لئے ابتدائی سطور میں ذکر سے یہ مطلب نہ اخذ کیا جائے کہ جلالوی صاحب مرحوم کی ذاتِ با برکات اور ان کے فیوض اور افادیت صرف ایک ادارے تک محدود تھے حقیقت حال یہ ہے کہ مولانا جلالوی کی قوم اور مذہب حقہ کے لئے جو بے لوث خدمات ہیں اس کا ایک مختصر مضمون میں احاطہ ناممکن ہے اس کے لئے تو ضخیم کتاب چاہیئے جس کو ان کے بہت سے احباب ملکر مرتب کر سکتے ہیں کیونکہ ان کی مختلف خوبیوں کا علم مختلف احباب کو تھا وہ خود تو ستائش اور شہرت کی تمنا سے کوسوں دور تھے اور نیک کام ایسی خاموشی سے انجام دیتے تھے کہ صرف قریبی جاننے والوں کو علم ہوتا تھا یہ ہماری بد قسمتی ہی ہے کہ قوم زندگی میں اچھے لوگوں کی قدر نہیں کرتی ہے اور جب کوئی گراں قدر ہستی بچھڑ جاتی ہے تب احساس ہوتا ہے کہ کتنا عظیم نقصان ہو گیا اور پھر ایسا خلا پیدا ہوتا ہے جو کبھی پر

نہیں ہوتا۔

جب زمانے کی ناسپاسی کا ذکر چھڑ ہی گیا تو بے اختیار مولانا عباس حیدر عابدی مرحوم یاد آگئے جو کہ خود بھی مولانا جلالوی صاحب کے بے حد مداحوں میں تھے وہ بھی ناقدری زمانہ کا شکار رہے اور جب بھی قوم پر کوئی برا وقت پڑتا ہے تو عابدی صاحب کی یاد قوم کو آتی ہے۔ سچ کہا ہے شاعر نے کہ۔

مرگئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

اور پھر مولانا عنایت حسین جلالوی صاحب مرحوم کی تو بات ہی دیگر تھی وہ اپنی ذات میں انجمن تھے لیکن کبھی داد ودہش کے طلبگار نہ تھے اور نہ صلے کی کبھی تمنا کی۔ ان کو تو بس کام کی لگن تھی اور دھن کے پکے تھے اور اسی جذبے اور لگن کے ساتھ نہایت خاموشی سے انہوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو تاریخی حیثیت کے حامل ہیں مجلس ملی کے صدر کی حیثیت سے مجلس کے پلیٹ فارم سے چند اہم سیمینار اور یادگار جلسے جو مولانا کی وساطت سے کراچی میں منعقد ہوئے اور خصوصیت سے رضویہ سوسائٹی کے امام بارگاہ میں برپا ہونے والے جلسوں کے متعلق اہل علم و دانش کی متفقہ رائے ہے کہ کراچی کی تاریخ میں اس نوعیت کے اتنے کامیاب جلسے کبھی انعقاد پذیر نہیں ہوئے جنہوں نے واقعتاً قوم کے لئے فکر وشعور کی نئی راہیں متعین کر دیں۔

اسی طرح مجلس ملی کی شائع کردہ کتابیں بھی قابل ذکر ہیں جن کی گو تعداد بہت زیادہ نہیں ہے لیکن افادیت کے لحاظ سے وہ مذہب اور ادب میں اپنا مقام رکھتی ہیں بالخصوص مشہور محقق اور ماہر تعلیم پروفیسر غلام عباس صاحب کی کتاب کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔ آپ نے میر انیس کے مرثیہ "یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر" کا انگریزی میں منظوم ترجمہ بھی فرمایا نیز عربی فارسی اور

اردو کے مشہور مرثیوں کے ایک ایک بند کا بھی انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا اور انگریزی میں ہی مرثیہ پر ایک بسیط مقالہ تحریر فرما کر کتاب میں چار چاند لگا دئے ۔ اس کتاب کے ذریعے نہ صرف صنف مرثیہ کی گرانقدر خدمت انجام دی بلکہ میر انیس کو بھی انگریزی ادب میں پہلی مرتبہ روشناس کرایا یہ اہم اور تاریخی کام مولانا عنایت حسین جلالوی صاحب مرحوم کی سربراہی میں انجام پایا ۔ انگریزی میں جیمز آف وزڈم اور لائف جیسی کتاب اور امام جعفر صادق علیہ السلام پر مقالات شائع کرنے کا شرف بھی مجلس ملی کو حاصل ہے ۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی انگریزی اور اردو کے نادر کتب مجلس ملی کے تحت مولانا جلالوی صاحب مرحوم کے دور صدارت میں شائع ہوئی ہیں جو یادگار رہیں گی ۔ تحریر کے ذریعے خدمات علیحدہ ہیں مجلس ملی ہی کے ذریعے وہ ذہنی اور فکری طور پر بھی قوم کو بیدار رکھنا چاہتے تھے اور مجلسِ ہٰذا کے تحت ہر ماہ منعقد ہونے والی فکری نشستوں نے قوم کو نہ صرف ملی احساس بلکہ سیاسی شعور سے بھی آشنا کیا مولانا کی ان خاموش خدمات سے اہل دانش بخوبی واقف ہیں ۔

مولانا سید محمد دہلوی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ کی سربراہی میں جب مطالبات کمیٹی بنی اور قوم نے جداگانہ دینیات اور دیگر شیعہ مطالبات کے لئے آواز اٹھائی تو مولانا جلالوی صاحب مرحوم نے قائد ملت مولانا سید محمد دہلوی صاحب کے دستِ راست کی حیثیت سے بھی اپنے دن رات ایک کر دیے۔ مگر کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا جلالوی مرحوم اور جناب محمود الحسن رضوی جیسے خاموش اور مخلص کارکنان تو بہت پہلے سے مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ مرحوم کے ساتھ ۱۹۵۰ء سے ہی اس مقصد کے لئے کوشاں اور سرگرداں تھے اور بہت سے قیمتی امور بھی بجا لا چکے تھے ۔

مولانا عنایت حسین جلالوی صاحب ایک صاحبِ طرز خطیب تھے

ان کی تقریریں پُر مغز، علمی اور مواد سے بھرپور ہوتی تھیں لیکن کراچی میں وہ روایتی اور مصروف ذاکر اس وجہ سے نہ بن سکے کہ انہوں نے ذکر حسینؑ کو تجارت نہیں بنایا تھا ۔ گو صاحب عیال تھے اور کثیر العیال بھی تھے ۔ اگر مجلسوں کا ہدیہ قبول کرلیتے تو کوئی عیب نہ تھا مگر جو ہستی نکاح پڑھانے کا ہدیہ نہ قبول کرے تو اس سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ ذاکری کو پیشہ بنائے گا اس سلسلے میں ایک واقعہ جس کے راوی پروفیسر غلام عباس صاحب مدظلہ ہیں، سن کر میں مولانا جلالوی کی عظمت اور کردار کی بلندی کا معترف ہو کر تہ دل سے عقید تمند ہو گیا تھا ۔

پروفسیر غلام عباس صاحب کا بیان ہے کہ وہ ایک شادی میں مدعو تھے نکاح خواں صاحب نے عین موقعہ پر معذرت کرلی اور منتظمین نے عین وقت پر جلالوی صاحب سے درخواست کی او رمولانا جن کو انکار کی تو عادت ہی نہ تھی فوراً اپنے گھر عزیز آباد سے عجلت میں شیروانی پہن کر ہمراہ ہولئے اور آکر نکاح پڑھا دیا نکاح کے بعد مولانا کو ہدیہ کا لفافہ پیش کیا گیا جو موصوف نے حسب عادت لینے سے انکار کر دیا ۔ شادیوں میں عام رواج ہے کہ نکاح کے بعد مولوی کو گھر بھجوانے کا کم لوگوں کو خیال ہوتا ہے مولانا نے کھانے کے بعد منتظمین سے اجازت لے کر خاموشی سے واپسی کی راہ لی ۔ پروفیسر عباس صاحب جو خود بھی عزیز آباد میں قیام پذیر ہیں اس خیال سے کہ مولانا کی ہمراہی ہوجائے گی پیچھے ہولئے ۔ عباس صاحب نے دیکھا کہ انجولی کے شادی ہال سے نکل کر مولانا جلالوی صاحب نے نہ بس لی نہ رکشا، ٹیکسی کا سہارا لیا اور فیڈرل بی ایریا جانے والی سڑک پر پیدل روانہ ہوگئے۔ پروفیسر غلام عباس صاحب تھوڑی دور خاموشی سے پیچھے چلتے ہوئے حقیقت حال تک پہنچ گئے اور مولانا عنایت جلالوی کو مخاطب کیا کہ قبلہ کیا ارادہ ہے نہ بس ، نہ رکشا ٹیکسی ، جواب دیا کہ بس ذرا ٹہلنے کا موڈ تھا اس وجہ

سے پیدل چل پڑا آپ نے بخوبی باور فرما لیا ہوگا کہ یہ اس عظیم انسان کا کردار تھا۔ جلدی میں مولانا جلالوی صاحب شیروانی زیب تن کر کے آگئے تھے پرس نہ لائے تھے اس لئے پیدل جا رہے تھے تب پروفیسر عباس صاحب نے ٹیکسی کر کے مولانا مرحوم کو گھر چھوڑا۔ اس دور میں جب کہ لوگ خمس، زکوۃ ہضم کر کے ڈکار نہیں لیتے مولانا نے اپنی محنت کا صلہ بھی نہیں لیا تھا اور کئی میل کا فاصلہ طے کر کے پیدل گھر جا رہے تھے۔

مولانا جلالوی جیسے قناعت پسند بھی دنیا میں کم ہونگے کالج میں پروفیسر تھے لیکن تعلیمی اسناد تقسیم کے وقت ہندوستان رہ جانے کی بناء پر ایک قلیل تنخواہ پر قانع رہے اور ہندوستان سے سرٹیفکیٹ منگوانے کا بندوبست نہ کیا اور کم تنخواہ لیتے رہے اتنی کم کہ جس کا تصور بھی محال ہے مگر خدا خوش رکھے اُن کے چند پرخلوص احباب کو جن میں جناب محمود رضوی پیش پیش تھے ان حضرات کی مساعی سے مولانا کو بالاخر صحیح گریڈ مل گیا۔

مولانا عنایت جلالوی صاحب مرحوم کی سیاسی بصیرت کا میں اس وجہ سے قائل ہوا کہ انہوں نے ساری زندگی میں صرف ایک دفعہ بھرپور سیاست میں حصہ لیا اور الیکشن لڑے اور منتخب ہونے کے بعد انہوں نے جب پوری طرح اندازہ کرلیا کہ ملکی سیاست میں قوم باکردار لوگوں کو ناپسند کرتی ہے تو آئندہ کے لئے سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے یا الیکشن لڑنے کے عمل سے ہمیشہ کے لئے گریزاں ہوگئے یہ ان کی فراست اور فہم وادراک کی خوبی تھی ورنہ سیاست کا چسکہ جس کو ایک مرتبہ لگے تو قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔

گذشتہ سے پیوستہ سال میرا ان کا ساتھ سفر میں ہوا تو میں نے ان کی مضبوط قوت ارادی کا بذات خود مشاہدہ کیا مولانا جلالوی صاحب پروفیسر غلام عباس صاحب ودیگر احباب کے ہمراہ عازم عراق و ایران برائے زیارات مقامات مقدسہ تھے کوئٹہ ریلوے اسٹیشن سے زاہدان تک وہ ہمارے ساتھ

تھے دل کی بیماری کی وجہ سے انتہائی کمزوری اور ناگفتہ بہ حالات میں وہ اتنے لمبے سفر کے لئے کمر بستہ تھے ان کی بیماری اور نقاہت کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ ہزاروں میل لمبے بس کے سفر کو بخیریت تمام کرلیں گے لیکن پروفیسر عباس صاحب کی دوران سفر نگہداشت وخدمت اور اپنے ایمان کی پختگی اور عقیدت کے سہارے وہ اس سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔

دنیا کی چند زبانیں الفاظ کے معاملے میں بہت امیر ہیں ان کے پاس لفظوں کا ذخیرہ ہے جن میں عربی ، فارسی ، سنسکرت ، انگریزی ، فرانسیسی وغیرہ نمایاں ہیں یہ بڑی قدیم زبانیں ہیں اور ان کی ترویج و ترقی کے لئے وہ ممالک جہاں یہ مستعمل ہیں باقاعدہ تحقیق وکاوش کرتے ہیں برخلاف اردو زبان جو کہ بہت نو عمر ہے الفاظ کے لحاظ سے دنیا کی چند غریب زبانوں میں سے ایک ہے گو کہ بولنے والے کروڑوں کی تعداد میں ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان کی سرپرستی کرنے والا کوئی ملک نہیں ہے یہ تمہیدی الفاظ اس لئے عرض کئے ہیں کہ اردو الفاظ کے لحاظ سے غریب ضرور ہے لیکن تعریف و توصیف کے لئے استعمال ہونے والے الفاظ اردو میں کافی تعداد میں موجود ہیں اور وہ سارے کے سارے الفاظ جتنے بھی ہیں آپ تصور میں لاتے جائیں ہر لفظ کا انطباق مولانا عنایت حسین جلالوی صاحب مرحوم پر ہوتا چلا جائے گا بلکہ ہر لفظ کے حوالے سے مولانا صاحب مرحوم کی زندگی پر ایک علیحدہ مضمون درکار ہوگا اور دیگر زبانوں سے بھی توصیفی الفاظ اگر مستعار لئے جائیں تو وہ بھی جلالوی صاحب پر منطبق ہوں گے یہ سب ایک طرف ان کو اپنے نفس پر اتنا کنٹرول تھا کبھی احباب نے ان کو برہم نہیں پایا نہ ابرو پر غصہ کی شکن دیکھی کسی نے کبھی سخت سست بھی کہدیا تو بجائے اس لہجے میں جواب دینے کے ایک دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ ٹالدیتے تھے اور زبان درازی کرنے والا شخص خود پشیمان ہوجاتا تھا۔

ڈاکٹر ندیم الحسن صاحب مرحوم جب تک زندہ رہے دوسرے تیسرے دن مولانا صاحب ان کے مطب پر تشریف لاتے تھے اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہونے کے مواقع ملتے تھے ڈاکٹر ندیم صاحب کی شہادت کے بعد ملاقاتیں کم ہو گئی تھیں جامعہ امامیہ ٹرسٹ کی میٹنگوں یا کسی تقریب میں یا بوتراب میں نماز جمعہ میں زیارت ہو جاتی تھی لیکن جب بھی ملاقات ہوتی تھی ان کی صحت کی خرابی کے آثار دیکھ کر تشویش بڑھ جاتی تھی اور ہم جیسے لوگ سوائے دعائے صحت کے کر بھی کیا سکتے تھے بالاخر ایک دن محترمہ شبیہ الحسن صاحب نقوی نے فون پر ان کے انتقال کی روح فرسا خبر سنائی تو صدمہ تو ایسا ہی جانکاہ ہوا جس طرح اپنے کسی ممدوح کے بچھڑ جانے کا ہوتا ہے لیکن ذہن میں ایک سوال بڑی شدت سے ابھرا کہ مولانا عنایت حسین جلالوی صاحب نے پوری زندگی اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ خلوص دل سے قوم کی خدمت کی لیکن قوم نے ان کو کیا دیا ۔ وہ جس عزت امتیاز اور توقیر کے مستحق تھے قوم کی اکثریت نے صحیح طور پر ان کو نوازنے میں کوتاہی تو نہیں کی ؟ اس سوال کا جواب میں کس سے طلب کروں یہ بھی مسئلہ ہے اپنے دل کو احتساب کے ارادے سے ٹٹولا تو جواب یہ ملا کہ مولانا کی موت کے بعد خراج تحسین پیش کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم اچھے اور باکردار کارکنان اور علماء کرام کی قدر ان کی زندگی میں کرلیں اس سے مولانا جلالوی صاحب کی روح بھی خوش ہوگی اور دینی خدمات کا صحیح سمت رجحان رکھنے والے افراد اور کارکنان کی ہمت افزائی بھی ۔

اللہ تعالی کے حضور میں عاجزی کے ساتھ چہاردہ معصومینؑ کے واسطے سے مولانا جلالوی صاحب کے لئے طلب مغفرت کرتے ہوئے اپنے مضمون کا اختتام کرتا ہوں اور قارئین سے بھی ملتمس ہوں کہ وہ سورہ فاتحہ پڑھکر ایصال ثواب فرمائیں کہ دنیا سے جانے کے بعد یہی تحفہ آپ ارواح مومنین کو ارسال کرسکتے ہیں ۔

خطیب مجلس چہلم حکیم سید باقر حسنین شہید

ممتاز الافاضل مولانا حکیم سید باقر حسنین شہید کی شفیق و خلیق ہستی بلاشبہ قوم ومذہب کا قیمتی اثاثہ تھی آپ ایک باعمل عالم اور ماہر نباض معالج تھے اور بلاتفریق مذہب وملت وبلاامتیاز زبان ومسلک انسانیت کے خدمتگار اور غیر پیشہ ور خطیب وعالم دین اور مولانا جلالوی کے دیرینہ و مخلص رفیق اور مجلس چہلم کے ذاکر تھے۔ ۱۰ جنوری ۹۵ ء کو یہ کتاب پریس میں زیر اشاعت تھی کہ آپ منصب شہادت سے ہمکنار ہوئے اور جلالوی صاحب کا غم پھر تازہ ہوگیا۔ ہم لواحقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ مرحوم کے لئے جوار معصومینؑ اور پسماندگان کیلئے صبر جمیل کی دعا کرتے ہوئے قارئین کرام سے سورہ فاتحہ کے ملتمس ہیں۔ شریک غم، متعلقین مولانا جلالوی

۱۹۸۳ء حج کے موقع پر حجاج کے کیمپ میں مناسک حج بیان کر رہے ہیں

پریمیئر کالج میں ساتھی اساتذہ کے ہمراہ

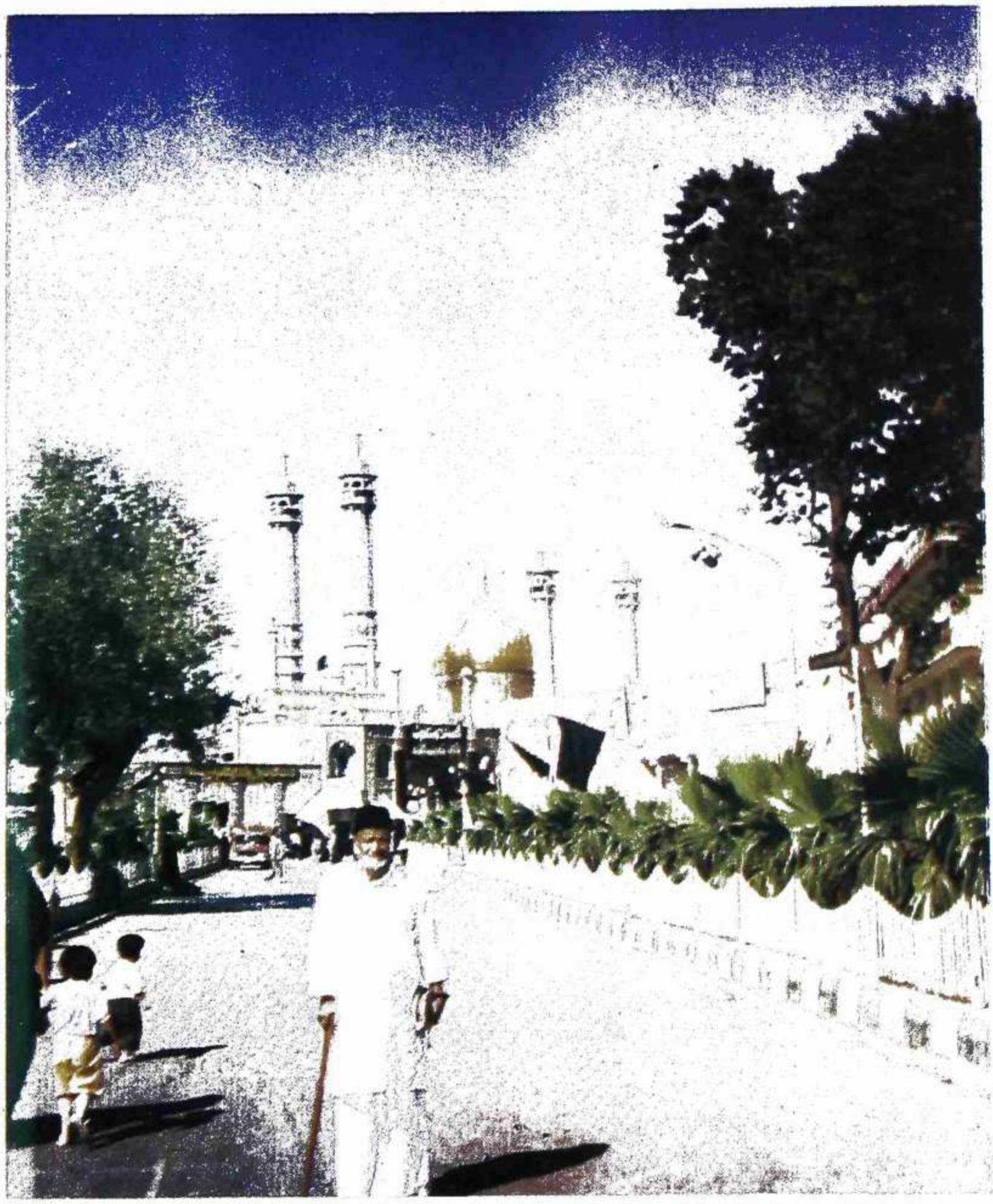

۱۹۹۳ء میں بی بی معصومہ قم کے روضہ پر حاضری اور باریابی

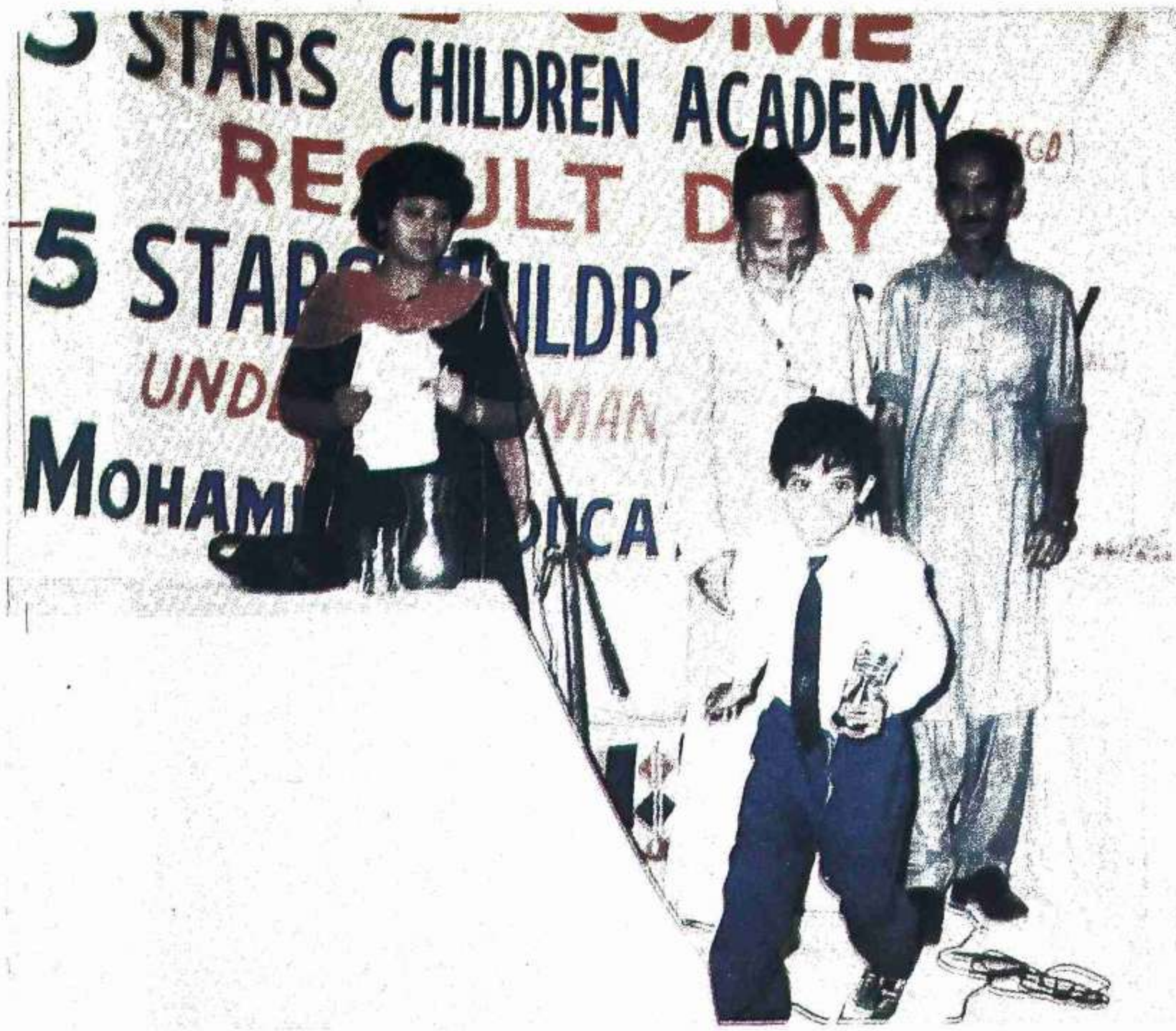

فائیو اسٹار اسکول کی تقریب تقسیم انعامات کے موقع پر

اہل اقتدار کی ہم نشینی سے متنفر عالم

پروفیسر حسن عسکری فاطمی

ہمارے عہد میں علم واخلاق کے نمونے ناپید ہوتے جارہے ہیں ۔ مادیت ، نفس پرستی اور خودغرضی عام ہے جس کے پاس جس قدر زیادہ دولت ، ثروت ہے اسی لحاظ سے اس کی قدر ومنزلت بھی ہے ۔ عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا خود اہلِ علم ان عام اخلاقی گراوٹوں اور بگاڑ کا شکار ہیں جن میں کبھی نچلے طبقے کے کم علم لوگ مبتلا ہوتے تھے ۔ آج حال یہ ہے کہ علماء مع جبہ و دستار اہل ثروت اور مقتدر اصحاب کی ہم نشینی بلکہ کاسہ لیسی کرتے ہیں ان کا طرز زندگی مسرفانہ اور امیرانہ ہے جن پر کبھی ازروئے قرآن وسنت اخوان الشیاطین ہونے کا اطلاق کیا جاتا تھا آج ومحراب ومنبر پر فخر کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں ان کے مکانات محلات اور سواریاں شاہی طمطراق کا نمونہ ہیں حالانکہ جو شخص عالم دین ہونے کا مدعی ہو اس کے لئے زندگی کی یہ تمام آسائشیں بے معنی ہوجاتی ہیں اور وہ دنیاوی آلائشوں سے بے نیاز ، مخلوق کی خدمت اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں لگ جاتا ہے ۔ ایسا شخص جس کے پیش نظر صرف حقوق وفرائض کی آبرومندانہ تکمیل ہو اور جس کا عمل اس کے علم کی تصدیق کرتا ہو عالم دین کہلانے کا سزاوار ہے اور اسلامی اخلاق کا معیار ومیزان ایسے ہی علمائے اسلام کو بنی اسرائیل کے انبیاء کے ہم رتبہ قرار دیتا ہے ۔ یہی علماء امت مسلمہ کا سرمایہ اور وراثت دین حنیف ہیں ۔

مولانا عنایت حسین جلالوی ایسے ہی علماء کرام میں سے تھے میں ان کو پچھلے ۲۸ برس سے جانتا ہوں میں نے انہیں ہزاروں مرتبہ انسانی زندگی کے مختلف اعمال و وظائف انجام دیتے ہوئے دیکھا وہ مالی اعتبار سے درمیانہ

بلکہ اس سے بھی کم درجے کے فرد تھے لیکن اخلاق وکردار کے اعتبار سے نہایت آسودہ حال اور تقدیر الہیٰ پر مطمئن و شاداں تھے انہوں نے خانقاہی اور راہبانہ نہیں بھرپور انسانی زندگی گزاری علمی ، سماجی ، معاشرتی اور سیاسی شعبوں میں بھرپور حصہ لیا وہ ایک فعال اور سرگرم معاشرتی فرد تھے ان کے کاندھوں پر بال بچوں ، بہن بھائیوں ، دوستوں اور عزیزوں کی کفالت و خبر گیری کی ذمہ داریاں تھیں جن سے وہ بہ طریق احسن عہدہ برآ ہوئے انہوں نے کبھی اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتی مگر یہ امور تو تمام دیندار انجام دیتے ہیں سو انہوں نے بھی انجام دیئے وہ کیا امتیازات تھے جو انہیں ایک سچے عالم دین اور اچھے انسان کے مرتبے پر فائز کرتے ہیں ؟

ان امتیازات کی نشاندہی ان تاثرات کے اظہار کا باعث ہے ۔

سب سے پہلے ان سے میرا تعارف نواب افتخار حسین خاں کے یہاں ہوا تھا وہ اپنی وضعداری اور روائتی پہناوے شیروانی اور ٹوپی میں وہاں موجود تھے انہیں یہ سن کر بہت خوشی ہوئی تھی کہ میں صحافی ہوتے ہوئے ملی قومی اور مذہبی معاملات ومسائل میں گہری دلچسپی رکھتا ہوں خصوصاً اپنے مسلک وعقیدہ سے مختلف عقیدہ رکھنے والے مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا مزاج اور حوصلہ رکھتا ہوں پھر یہ ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور مولانا مجھے اپنا ہم فکر سمجھنے لگے اور اپنے ہم سن ہونے کی بے تکلفی کا اعزاز انہوں نے مجھے بخش دیا یوں مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ۔ وہ کثیر الاحباب نہیں تھے لیکن جن کو اپنا دوست سمجھتے تھے ان سے سچی اور مخلصانہ محبت کرتے تھے وہ کبھی ایک دوست کی غیبت دوسرے سے نہ کرتے خواہ وہ دوست ان کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچاتا انہیں ہرگز یہ زعم نہیں تھا کہ وہ ایک متبحر عالم ہیں اور اسی لحاظ سے ان کی تکریم کی جانی چاہیئے وہ عام دوستوں کی تنقید خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے اور لاتعلقی یا بات چیت بند نہ کرتے تھے جب دوبارہ

ملتے اس طرح کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو میرے نزدیک یہ ان کے کامل ہونے کی دلیل تھی۔

میں نے انہیں مولانا سید محمد دہلوی مرحوم، علامہ سید محمد رضی مجتہد علامہ ابن حسن جارچوی مرحوم اور ایسے ہی دیگر علماء کی صحبتوں میں دیکھا وہ ان بزرگوں کا احترام اس طرح کرتے تھے جس طرح ایک ادنیٰ شاگرد اپنے اساتذہ کا کرتا ہے حتیٰ کہ وہ کبھی ان کی طرف پشت بھی نہ کرتے تھے حالانکہ علمی اعتبار سے مولانا جلالوی خود ایک بڑے مرتبے پر فائز تھے وہ شیعہ مطالبات کمیٹی کے سرگرم رہنماؤں میں سے تھے لیکن اتحاد بین المسلمین اور پان اسلام ازم کے بھی پرجوش حامی تھے چنانچہ جب میں نے جماعت اسلامی کے اخبار روزنامہ جسارت کراچی سے وابستگی کے دور میں ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے موقع پر شیعہ علماء کے تفصیلی انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا تو انہوں نے میری بڑی مدد کی اور علماء سے رابطے میں اہم کردار ادا کیا یہ ان کی اسلام اور عام مسلمانوں سے محبت کا ثبوت تھا۔

وہ علم و فضیلت کے معاملے میں مولانا حافظ کفایت حسین مرحوم، مولانا مصطفیٰ جوہر اور مولانا مہدی پویا مرحوم سے بہت متاثر تھے۔ مولانا جلالوی کو سب سے زیادہ زندگی میں جس فعل سے نفرت تھی وہ اہل اقتدار کی ہم نشینی تھی یہی وجہ تھی انہوں نے کبھی کسی صاحب اقتدار کے در دولت پر جبہ سائی نہیں کی۔

ایک زمانہ تھا کہ وہ سیٹھ حمید حبیب کے ٹیوٹر تھے لیکن انہوں نے کبھی اپنی اس حیثیت کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ کسی مادی احسان سے زیر بار ہوئے چنانچہ دستگیر کالونی میں ایک معمولی مکان روئے زمین پر ان کا کل ترکہ ہے جو انہوں نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے اور یہ مکان چند سال پہلے بڑی مشکل سے مکمل ہوا۔ وہ کوئی چالیس برس بعد اپنے بال بچوں کیلئے پختہ

چھت فراہم کرسکے حالانکہ ان سے بہت کم حیثیت کے لوگوں نے محلات کھڑے کرلیئے۔

وہ عہد ایوبی میں بی ڈی ممبر بھی منتخب ہوئے تھے لیکن انہوں نے سات ہزار روپے کی پیش کش کے باوجود اپنا ووٹ فروخت نہیں کیا اس زمانے کی یہ رقم آج کے سات لاکھ کے برابر ہے اور مولانا اس زمانے میں مالی طور پر بہت پریشان بھی تھے۔

پروفیسر غلام عباس، مولانا کے بہت قریبی احباب میں شامل تھے اور آج بھی انکے لئے اشکبار ہیں انہوں نے بتایا کہ مولانا مجلس پڑھنے اور نکاح خوانی کا ہدیہ قبول نہیں کرتے تھے۔

ان کی طبع صوفیانہ اور مزاج درویشانہ کے سب سے بڑے مداح ڈاکٹر ندیم الحسن شہید تھے جن کے والد ماجد مولانا سید ظفر حسن قبلہ امروہوی کی قائم کردہ جامعہ امامیہ ناظم آباد میں ان کی مجلسِ ملی کا دفتر آج بھی ان کی رحلت پر نوحہ کناں ہے مجلسِ ملی کے وہ چیف ٹرسٹی اور سربراہ تھے اس حیثیت میں انہوں نے بڑی لیاقت، دیانت اور سرگرمی کے ساتھ قومی وملی فکر کی آبیاری کی اور قومی فلاحی ادارے کی قیادت کا ایک ولولہ انگیز نمونہ چھوڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ خصوصاً ان کے تیسرے بیٹے سلمان میاں سے مجھے بہت توقعات ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں طلاقت لسانی اور خطابت کا جوہر عطا کیا ہے اگر وہ اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چلتے رہے تو میں سمجھوں گا کہ مولانا جلالوی زندہ ہیں اور صرف ان کا جسد خاکی ہم سے بچھڑا ہے اور ان کی سیرۃ زندہ وتابندہ ہے۔

قابل فخر دوست

:جناب مولانا مرزا محمد جعفر

ایک ذھین ترین ، فعال ، مستعد ، متحرک اور درسی کتب کے علاوہ دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں نمایاں کردار ، یعنی بااخلاص ، بامروت اور سب کے دوست انسانیت اور انسان کے شیفتہ وگرویدہ جنہیں اب مرحوم لکھتے ہوئے قلم کے آنسو خشک ہو رہے ہیں ۔

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہُو آتا ہے جب نہیں آتا

سید عنایت حسین جلالوی ، زمانہ طالبعلمی میں بھی بہترین مقرر اور بہترین لکھنے والے اور بلاشبہ ناظمیہ کے ان قابلِ فخر طلباء میں شمار ہوتے تھے جنہیں تحریر اور تقریر دونوں پر عبور اور دونوں میں ممتاز مقام حاصل تھا ۔

میرے ہم جماعت ، ہم خیال ، ہم آواز اور ہمراز ودمساز
گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

پاکستان آنے کے بعد بھی وہ انہیں علمی ، فکری اور دینی امور میں انتہائی تندہی اور اخلاص کے ساتھ منہمک رہے جن کے تحت انہوں نے لکھنو میں کُل ھند ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی اور " العلم " نامی رسالہ جاری کیا ۔

یہ سب مرحوم کی خدمات جلیلہ کی یادگاریں ہیں ، پتہ نہیں ان میں کون زندہ ہے اور کون چل بسا ۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

انتقال سے چار روز قبل مرحوم کے صاحبزادے کے ذریعے مجھے ان کا خط ملا تھا جس میں انہوں نے خود کو "چراغ سحری" سے تعبیر کیا تھا، میں ان کی خواہش کے مطابق ان کی مطلوبہ معلومات ہی جمع کرتا رہا اور وہ چراغ سحری کی عملی تصویر بن کر کبھی نہ آنے کیلئے رخصت ہوگئے۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

یقیناً مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مولانا مرحوم جیسے یگانہ روزگار، نامساعد حالات سے نہ گھبرانے والے، عزم وہمت کے پیکر، ہر حال میں صابر و شاکر لوگ چراغ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے ان کے رخصت ہونے سے جہاں میں اپنے دیرینہ ہمدم و ہمراز سے محروم ہوگیا وہاں ہر وہ ادارہ جس سے وہ کسی بھی طور وابستہ تھے ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہوا ہے۔

اک چراغ اور گل ہوا

الحاج پروفیسر سید زین العابدین

میں مولانا سے اس وقت سے واقف ہوں جب وہ لیاقت آباد ۔ بی ۔ ون ایریا میں رہتے تھے اور حسینی اسکول ناظم آباد میں ٹیچر تھے مولانا مخلص ، محبت کرنے والے ، ہر دلعزیز تھے ۔ وہ عوام میں بلا تفریق مقبول تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ایوب خان کے دور میں بی ڈی کا الیکشن لڑا اور منتخب ہوئے ۔

قومیات میں بھی دلچسپی لیتے تھے ۔ آپ نے اس دور میں بی ون ایریا میں ایک مسجد و امام بارگاہ کیلئے کوشش کی وہاں ایک بہت بڑا کنواں تھا اور اس کے اردگرد کچھ زمین تھی لوگوں کے تعاون سے وہ زمین حاصل کی گئی اور آج وہاں مسجد وامام بارگاہ عابدیہ قائم ہے۔ اس مسجد میں کچھ عرصے بلا معاوضہ سخن فتحپوری مرحوم نے نماز پڑھائی ۔ وہ بھی اللہ کو پیارے ہوئے ۔ خدا جانے کیا بات ہے اب مخلص کارکن ایک ایک کرکے اٹھتے جارہے ہیں ، مولانا عنایت حسین جلالوی بھی بلاشبہ ایک مخلص کارکن تھے ۔ انہوں نے اپنی خدمات کے صلے میں نہ نام چاہا نہ مال چاہا ۔ اللہ ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے ان کے درجات کو بلند کرے ۔

ایوب خاں ہی کے دور میں مولانا سید محمد صاحب دہلوی اعلی اللہ مقامہ نے مطالبات کمیٹی کے نام سے تحریک چلائی خدا کا شکر ہے تین مطالبات تھے تینوں منظور ہوئے ۔ آج جو آپ کو کالجوں ، اسکولوں میں شیعہ مولوی نظر آرہے ہیں یہ اسی کمیٹی کی مساعی کا نتیجہ ہیں ۔ آج بھی طے شدہ امر ہے کہ بچوں کو دینیات جو پڑھائی جائے تو اسی حد تک محدود رہے جو منظور شدہ کتاب میں درج ہے ۔ اس کے علاوہ نہیں یہ بھی اسی تحریک کا نتیجہ ہے

مولانا عنایت حسین جلالوی صاحب بھی ہمارے ساتھ اس تحریک میں سرگرم عمل رہے ۔ مظہر عباس مرحوم ، رضا الہ آبادی ، مولانا جلالوی ، راقم الحروف اس تحریک کے ادنیٰ کارکنان میں سے تھے ۔ آج کے قائدین غور کریں کہ کیا وجہ تھی کہ مطالبات سب منظور ہوئے اور مشرقی ومغربی پاکستان پورے ملک میں کسی کی ایک نکسیر بھی نہیں پھوٹی ۔ مولانا سید محمد صاحب قبلہ کی نظرمیں کچھ مخلص صائب الرائے حضرات تھے ان سے ہی مشورہ کرلیا کرتے تھے جن میں جناب جسٹس جمیل حسین رضوی مرحوم (جو صوبائی وزیر بھی رہے اور سید محمد صاحب قبلہ کے انتقال کے بعد وہی مطالبات کمیٹی کے سربراہ بھی ہوئے) جناب قبلہ مرزا یوسف حسین صاحب لکھنوی مرحوم (میانوالی) جناب اسرار حسین وکیل مرحوم ۔ انہیں لوگوں میں جن سے مشورہ لیا جاتا تھا جناب عنایت حسین جلالوی صاحب مرحوم بھی تھے۔ چنانچہ مطالبات کمیٹی نے جگہ جگہ کنونشن منعقد کئے بڑے بڑے جلسے ہوئے ملتان کنونشن میں مولانا کی تقریر آج بھی نظروں میں گھوم رہی ہے انہوں نے مجمع کو گرما دیا ۔ یہ فن ان کو اچھی طرح آتا تھا ۔ چوہدری غلام عباس نے رات کے اجلاس کی صدارت کی ، ان کے الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں اسی طرح آخری ضرب راولپنڈی کنونشن ہوا ۔ ڈاکٹر اجمل کی کوٹھی پر دس بارہ ہزار کا مجمع ۔ اسرار حسین صاحب وکیل مرحوم بھی موجود تھے وہاں بھی مولانا عنایت حسین نے تقریر کی تھی ۔ وہاں کا یہ عالم تھا ۔ باپ نے اسٹیج پر خود کفن پہنا اور اپنے جوان بیٹے کو کفن پہنایا ۔ ایوب خان صاحب دوتین مرتبہ خود گاڑی میں ادھر سے گزرے ۔ تا کہ اپنی آنکھ سے مشاہدہ کرلیں کہ لوگوں میں کتنا جذبہ ہے جوش وخروش کا کیا حال ہے مجمع کتنا ہے تقاریر جو مسلسل ہو رہی تھیں اور لاوڈ اسپیکر پر دور تک سنائی دے رہی تھیں اس کو بھی سن سکیں ۔

قصہ مختصر مولانا جلالوی ہر منزل پر ساتھ رہے پیچھے نہیں ہٹے ۔ مجلس ملی کے نام سے ادارہ قائم کرنے والوں میں وہ بھی تھے۔ اس کی طرف سے ہر مہینے نشست ہوتی مقالے پڑھے جاتے۔ مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو لکھنے پڑھنے کی طرف رغبت دلائی جائے۔ پھر مجلس ملی کی طرف سے بڑے اچھے اچھے علمی جلسے ہوئے ، علی گڑھ یونیورسٹی کے اسکالر اور آسٹریلیا کی یونیورسٹی کے پورفیسر ڈاکٹر اطہر عباس رضوی کا پرمغز مقالہ آج بھی اپنی افادیت رکھتا ہے ۔ اسی ادارہ نے مرزا حفاظت حسین کی کتاب "Life" کو شائع کیا جو اپنے موضوع کے اعتبار سے اچھوتی اور معلوماتی کتاب ہے ۔ اس طرح مجلس ملی ہی نے ایک اور شاہکار پیش کیا یعنی میر انیس اعلی اللہ مقامہ کے ایک مرثیے کا انگریزی میں منظوم ترجمہ اور آج بھی یہ ادارہ خاموشی سے سرگرم عمل ہے ۔ حال ہی میں وقت کی ایک اہم ضرورت " واقعہ حرہ " تالیف جناب محمود الحسن رضوی مدظلہ شائع کی ۔ یہ سب نقوش قدم نوجوانوں کے لیئے ہیں تا کہ آئندہ اپنے مسائل حل کرنے میں ان سے استفادہ کر سکیں خداوند کریم مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ یاد رکھئے حدیث ہے جو آلؑ محمد کی محبت پر مرتا ہے شہید مرتا ہے ۔ تائب مرتا ہے ۔ خداوند کریم اس پرآشوب دور میں ہم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے ۔ ہماری غلطیوں کو معاف کرے، ہماری اصلاح کرے۔

سیّد عنایت حسین جلالوی! ایک ادارہ

سید احمد جوہر دہلوی

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دنیا میں ہر ذی روح شے کے لئے موت آنی یقینی اور ضروری ہے اور کسی شخص کو بھی موت سے مفر نہیں لیکن وہ لوگ جو اپنے دل میں محبت اہلبیتؑ لیئے ہوئے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں وہ مردہ نہیں بلکہ حدیث رسولؐ کے مطابق وہ شہید ومغفور ہیں ۔ وہ مومن اور کامل الایمان ہیں ، ملک الموت ان کو جنت کی بشارت دیتا ہے۔ ان کی روح جنت کی جانب اس طرح پرواز کرتی ہے جیسے ایک دلہن رخصت ہو کراپنے شوہر کے گھر جاتی ہے پھر ان کی قبر میں جنت کی ایک کھڑکی کھل جاتی ہے اور پروردگارِ عالم ان کی قبر کو زیارت گاہ ملائکہ قرار دیتا ہے۔ اب قابل غور امر یہ ہے کہ جب ایک عام محب کا یہ شرف ومرتبہ ہے تو نگاہ قدرت میں اس ذات کی کس قدر منزلت ہوگی جس نے محبت اہلبیتؑ کا درس دیتے ہوئے اور ان کے فضائل ومصائب بیان کرتے ہوئے اپنی تمام عمر گزار دی ہے ۔ مولانا جلالوی مرحوم کا شمار بھی ایسے ہی علماء باعمل میں ہوتا ہے جن کی دینی اور قومی خدمات کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔

اگر مولانا کی عملی زندگی کا ایک مختصر جائزہ لیا جائے تو اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی ایک وہ دور جب تقسیم ہندوپاک سے قبل لکھنو میں زیر تعلیم رہے دوسرا وہ عہد جب مولانا نے ہجرت کر کے مستقل طور پر کراچی میں سکونت اختیار کی اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا ۔ قیام لکھنو کے دوران مرحوم نے ناظمیہ عربک کالج اور لکھنو یونیورسٹی سے عربی ، فارسی اور اردو کی اعلیٰ اسناد حاصل کیں اور فارغ التحصیل ہوئے ۔

مشہور ومعروف شیعہ عالم جناب علامہ مولانا حافظ کفایت حسین اعلیٰ اللہ مقامہ، سے فخرِ تلمذ حاصل کیا اور ان کے لائق و ہونہار شاگردوں میں شمار ہوئے اور یہی وہ زمانہ تھا جب مولانا جلالوی کو لکھنو کے مشاہیر، علماء اور ممتاز خطیبوں سے قریب رہنے کا موقعہ ملا۔ ان کے آداب محفل دیکھے، ان کی علمی نشستوں اور مذاکروں میں شریک ہوئے ۔ ان کی اخلاقی اور دینی تعلیمات سے استفادہ کیا۔ سرکار ناصر الملت اور سرکار نجم العلماء جیسے جلیل القدر علماء کے درباروں میں حاضری دی اور یہ انہی حضرات کی خدمت اور فیض صحبت کا کرشمہ تھا کہ لکھنو کے ادبی ، سماجی ، مذہبی اور سیاسی حلقوں میں ایک شعلہ بیان مقرر کے طور پر بہت جلد روشناس ہوگئے اور مختلف جلسوں سے خطاب کرکے اپنے سامعین سے خراج تحسین حاصل کیا اور بالخصوص راجہ صاحب محمود آباد اور مولانا ابن حسن جارچوری قبلہ کی فرمائش پر مسلم لیگ کے جلسوں میں حصہ لینا شروع کردیا اور لوگوں کو مسلم لیگ میں شرکت کی دعوت دے کر ایک عظیم قومی خدمت انجام دی ۔ اس طرح مولانا جلالوی نے لکھنو کے ادبی ، سماجی ، مذہبی اور سیاسی حلقوں میں اپنا ایک نمایاں اور منفرد مقام بنا لیا۔

اگرچہ مرحوم کے ہم مکتبوں میں بہت سے علماء قابل ذکر ہیں لیکن سرکار ناصرالملت کے مشہور کتب خانہ ناصری میں جہاں دوران تعلیم میرا بھی مستقل قیام تھا جب شام کے وقت اکثر اہل علم حضرات کا مخصوص اجتماع ہوجاتا اور میرے اصرار وفرمائش پر مولانا جلالوی تشریف لاتے تو جن حضرات کو مولانا سے خصوصی قربت رہی ان میں سرفہرست مولانا ضیا الحسن موسوی ، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل ، مولانا تصدق امروہوی ، مولانا ایوب حسین سرسوی ، مولانا وجیہ الحسن اور مولانا حشمت جیسے اہل علم حضرات سرفہرست نظر آتے ہیں اور مرحوم کی آمد کے بعد ایک ایسی علمی اور ادبی محفل جم جاتی

جس کا سلسلہ گھنٹوں جاری رہتا ۔ اگرچہ اس دور کی ان محترم شخصیات میں سے اکثر کی وفات ہو چکی ہے لیکن جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو ذہن میں ان حضرات کی تصویر ابھر کر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں ۔

جہاں تک مولانا جلالوی کے دوسرے دور کا تعلق ہے تو قیام واستحکام پاکستان کے بعد جب وہ مستقل طور پر کراچی میں رہائش پذیر ہوگئے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا لیکن اس کے ساتھ خدمتِ اہلبیتؑ کا عمل بھی جاری رکھا ، مقامی طور پر اور بیرون سے جب بھی مرحوم کو مجالس کے سلسلے میں مدعو کیا جاتا تو مومنین کی فرمائش کبھی رد نہ کی جاتی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بے شمار مجالس سے گرچہ خطاب فرمایا لیکن محراب ومنبر کے تقدس کو اس طرح پیش نظر رکھا کہ جس کی اس دور میں مثال ملنا مشکل ہے اور یہی ان کے کردار کی وہ اہم خوبی ہے جو دیگر ذاکرین سے مرحوم کو ممتاز کرتی ہے اور انکی پاکیزگیٔ نفس کی سب سے بڑی دلیل ہے ۔ مرحوم نے اہل لکھنو کی قومی زندگی کا بڑا قریب سے مطالعہ کیا تھا اور بڑی حد تک مرحوم کو اس سے وابستگی رہی تھی اور یہاں بھی کراچی کے وہ حضرات جو قومیات سے دلچسپی رکھتے تھے بہت جلد ان سے قریب تر ہوگئے ۔ اور ویسے بھی مرحوم کی شخصیت صرف اپنی ذات تک محدود نہ تھی ۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہی نہیں بلکہ مکمل ادارہ تھے۔ ان کا شیریں بیان اور موثر انداز گفتگو کا طریقہ اور لوگوں کو جلد ہی ہم خیال بنانے کی خداداد صلاحیت ان تمام صفات نے نہ صرف حلقۂ احباب میں ان کو مقبول وہر دلعزیز کیا بلکہ غیروں میں بہت جلد روشناس و ہر دلعزیز کر دیا اور جو بھی ایک بار ان سے مل لیتا ان کی صحبت وخلوص اور اخلاص اور اخلاق کا گرویدہ ہوجاتا یہی سبب تھا کہ ملت جعفریہ کا کوئی مذہبی جلسہ ہو یا قومی اجتماع لوگ ان کی آمد کے منتظر رہتے اور جب وہ آجاتے تو رونق محفل میں

اضافہ ہوجاتا۔

اب وہ علماء شیعہ پاکستان کا کنونشن ہو یا پاکستان شیعہ مطالبات کمیٹی کا یادگار اجتماع یا مجلس ملی کا سالانہ اجلاس یا ادارہ حقوق شیعہ کا اہم اجلاس یا مرکزی شیعہ فیڈریشن اور تنظیم عزاء کا سالانہ اجلاس یہ ممکن نہ تھا کہ مولانا جلالوی کو خصوصی طور پر مدعو نہ کیا جاتا ہو چونکہ مولانا کا علمی مطالعہ اور قومیات و سیاست کا عملی تجربہ اس قدر وسیع تھا کہ جب بھی کسی الجھے ہوئے مسئلہ پر ان کی رائے طلب کی جاتی تو اس قدر عمدگی اور مدلل طریقے سے اپنے خیالات کا اظہار فرماتے کہ جس کے بعد شدید ترین مخالف کو بھی جرأت اختلاف نہ ہوتی بلکہ ان کی پیش کردہ تجویز کی تائید کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی دوررس نگاہی علمی اور سیاسی بصیرت اور غیر جانبداری اس قدر مسلمہ تھی کہ ملت کے ہر فرد کو ان پر مکمل اعتماد تھا اور آج بھی انتہائی احترام وعقیدت سے مرحوم کو یاد کیا جاتا ہے اور ان کی وفات سے کراچی کی قومی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ہے ایک طویل عرصے تک پر نہ ہوسکے گا۔

مولانا جلالوی اور تحریکِ مطالبات

والد مرحوم خطیب اعظم اعلیٰ اللہ مقامہ نے جب تحریک شیعہ مطالبات کے سلسلہ میں کل پاکستان شیعہ علماء کنونشن کے انعقاد کا ارادہ کیا تو نگاہ انتخاب مولانا جلالوی پر پڑی اور ان پر مرحوم کو اس قدر اعتماد و بھروسہ تھا کہ خصوصی طور پر اپنا معاون ومددگار منتخب کیا اور علمائے کرام کے دعوت ناموں کی ابتداء سے اختتام اجلاس تک ہر طرح کے مشوروں اور علماء کرام کے قیام وطعام کے انتظامات میں خطیب اعظم کے ساتھ رہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک گیر پیمانے پر علمائے شیعہ پاکستان کا یہی وہ یادگار و عظیم کنونشن تھا جو امام بارگاہ شاہ کربلا (رضویہ سوسائٹی) میں

جنوری ۱۹۶۴ء میں منعقد ہوا اور جس میں ملک سے جلیل القدر علماء نے شرکت فرمائی ۔ اس کنونشن میں جتنے بھی علماء تشریف لائے ان تمام ہی نے مولانا جلالوی اور ان کے چنیدہ احباب کے حسن انتظام کی تعریف کی اور مولانا کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی ان اجلاسوں کا سلسلہ ۳ شب وروز تک جاری رہا اور یہی وہ یادگار کنونشن ہے جس میں خطیب اعظم کو تحریک مطالبات کا سربراہ نامزد کیا گیا اور وہ ملت جعفریہ کے پہلے قائد کہلائے اور اسی اجلاس میں متفقہ طور پر ۳ تجاویز منظور کی گئیں جو تحریک مطالبات کا سرنامہ قرار پائیں ۔

(۱) جداگانہ نصاب دینیات (۲) جداگانہ شیعہ اوقاف بورڈ (۳) تحفظ عزاداری

دیکھا جائے تو آل پاکستان شیعہ مطالبات کی تحریک بڑا طویل سفر ہے جس کی تفصیل کے لئے ایک مختصر سا مضمون ناکافی ہے ۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ۵ جنوری ۱۹۶۴ء کو جس عظیم الشان کنونشن کے ذریعے اس تحریک کی ابتداء ہوئی اس کے بعد کراچی سے خیبر اور خیبر سے پارا چنار اور اسکردو تک شاید ہی کوئی مقام ایسا ہو جہاں شیعہ آبادی ہو اور شیعہ مطالبات کے سلسلے میں اس مقام پر مطالبات کمیٹی کا جلسہ نہ ہوا ہو دراصل پاکستان شیعہ مطالبات کمیٹی کی یہ وہ عظیم تحریک تھی جس میں قوم کے ہر فرد نے عملی طور پر حصہ لیا ۔ ہزاروں کی تعداد میں مومنین کرام مختلف مقامات واجتماعات میں شریک ہوئے ۔ اور یہ اس پانچ سالہ دن رات کی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ راولپنڈی کے عظیم الشان کنونشن میں ۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو ملت جعفریہ کی یہ تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور حکومت کی جانب سے شیعہ مطالبات کی منظوری کا اعلان کیا گیا۔

مولانا سید عنایت حسین جلالوی مرحوم نے آل پاکستان شیعہ مطالبات کمیٹی کی تحریک میں خطیب اعظم مولانا سید محمد صاحب قبلہ دہلوی

اعلیٰ اللہ مقامہ کی قیادت میں اور ان کی وفات کے بعد بھی جس خلوص ومحبت ، دیانتداری اور بے لوث جذبے کے ساتھ قومی خدمات انجام دیں ان کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ہر شیعہ کنونشن اور اہم اجتماع کے موقعہ پر خطیب اعظم کے ہمراہ رہے کبھی مرحوم نے مولانا جلالوی کو مجلس عامہ کے رکن کے طور پر منتخب کیا کبھی صدر پاکستان سے ملاقات کرنے والے وفد میں اپنے ہمراہ لے گئے کبھی مجلس عمل علماء شیعہ کراچی کے لئے بطور کنوینر نامزد کیا اور جب سے شیعہ مطالبات کمیٹی کراچی کا قیام عمل میں آیا مولانا جلالوی کو نائب صدر کراچی کے عہدے پر نامزد کیا گیا اور جب خطیب اعظم کی وفات ہو گئی تو جسٹس جمیل حسین رضوی مرحوم نے راقم الحروف کو کراچی مطالبات کمیٹی کا صدر اور مولانا کو سابق عہدہ نائب صدر پر بدستور بحال رکھا اور اس کے بعد مرحوم ۴ سال تک نائب صدر کے طور پر قومی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کل کے پرآشوب دور میں ان سے مخلص ، مہربان اور ہمدرد دوست کا ملنا بڑا دشوار ہے اور ان کی پرخلوص دوستی اور محبت پر مجھے آج بھی فخر ہے ۔ بے شک وہ مرحوم آج ہمارے درمیان نہیں لیکن مجھے ہر دم یہ محسوس ہوتا ہے کہ نہ جانے کس وقت آواز دیتے ہوئے آجائیں کہ میاں جوہر آج کل کیا ہو رہا ہے اور قوم کا کیا حال ہے ؟

پروردگار عالم ان کی روح کو جنت میں مقام عالیہ عطا فرمائے ! ہم تو جناب محشر لکھنوی صاحب کے بقول صرف یہی کہہ سکتے ہیں !

صرف ذکرِ حق رہا جس کا ہمیشہ سے شعار
وہ محبِ اہلبیتِ مصطفیٰ جاتا رہا

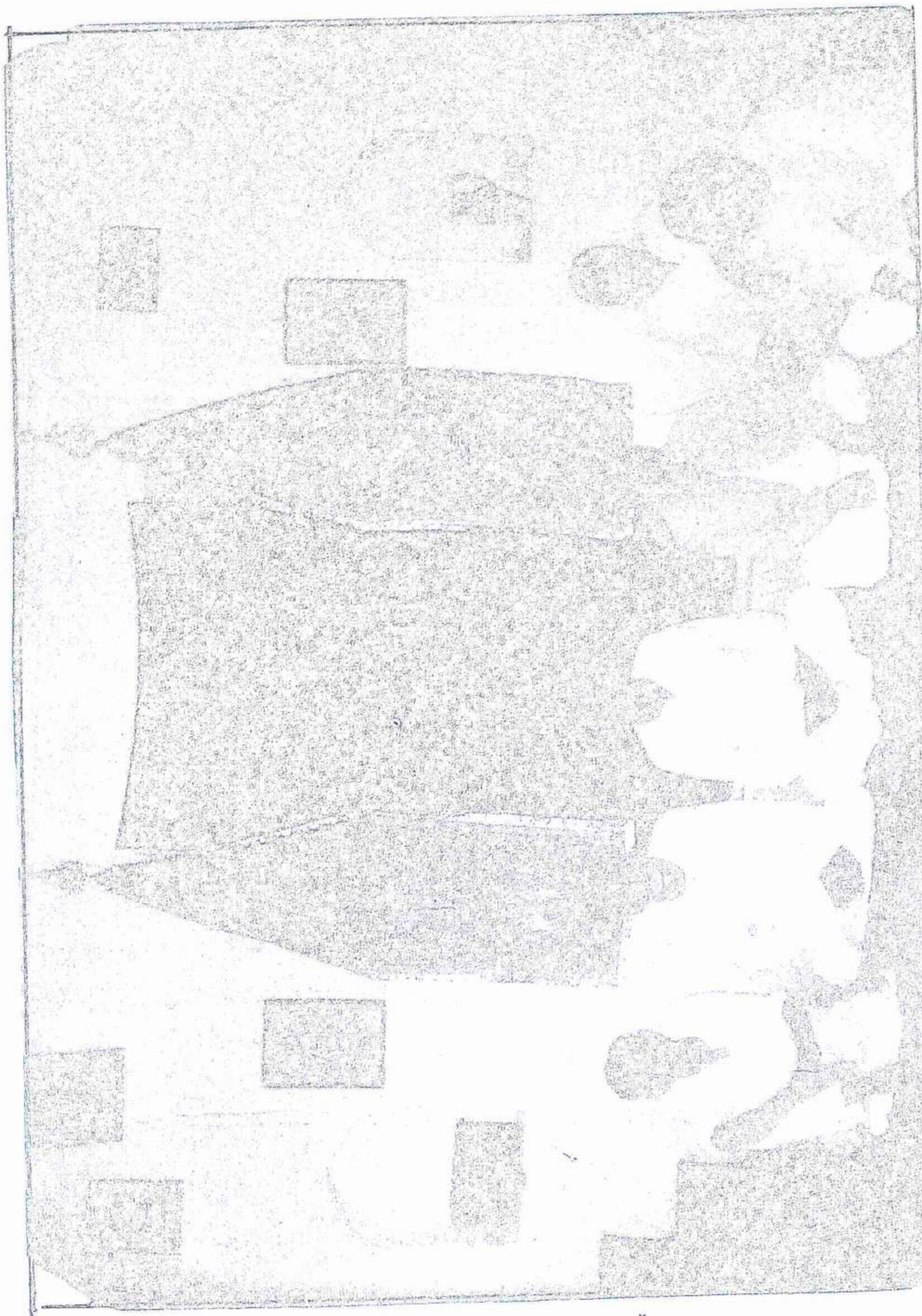

مولانا دورہ ہند کے موقع پر اپنے وطن مالوف (جلالی) کی امام بارگاہ میں اعزہ کے ہمراہ

علم وادب کے شیدائی تحریک پاکستان کے سپاہی

مولوی سید محمد عون نقوی

(مولانا سید محمد عون نقوی کا یہ مضمون روزنامہ نوائے وقت، پبلک اور امن میں شائع ہوا)

۱۷ رمضان المبارک ۱۳۴۵ ہجری کے اس نیک دن کو اس دنیا میں پیدا ہونے والے عظیم المرتبت شخصیت (سید عنایت حسین جلالوی) جس دن وتاریخ کو اسلام کی اولین فتح یعنی فتح بدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انڈیا کے ضلع علی گڑھ کے قصبے جلالی کے علمی اور روحانی خاندان کی نامور شخصیت سید انعام حسین نے اپنے فرزند سید عنایت حسین کو ابتدائی تعلیم جلالی کے مدرسے سے ہی دلوائی ۔ پروفیسر علامہ سید عنایت حسین نے ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنو میں مسلسل چودہ سال مدرسہ ناظمیہ عربک کالج کے مروجہ نصاب کے مطابق ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی ۔آپ نے لکھنو یونیورسٹی سے دبیر کامل اور فاضل ادب کرنے کے علاوہ الہ آباد بورڈ سے مولوی عالم کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کئے۔ آپ نے تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا اور مسلمانوں میں جذبہ حریت بیدار کرنے میں معاون ثابت ہوئے آپ نے قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ شعلہ بیانی سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر لوگوں کو مسلم لیگ کی طرف آمادہ کیا۔یہی وجہ تھی کہ معماران پاکستان کی اہم شخصیت راجہ صاحب ۔ کو علامہ سے خاص انسیت تھی ۔

پروفیسر علامہ عنایت حسین انڈیا میں جلالوی صاحب کے نام سے مشہور تھے کیونکہ آپ مذہبی رہنما ہونے کے علاوہ ایک سماجی ادبی اور نڈر کارکن بھی تھے آپ نے اپنے ہم عصر علامہ مفتی آغا طیب جزائری مجتہد (ایران) ، علامہ مرتضیٰ حسین فاضل اور علامہ کلب عابد مجتہد کے ساتھ مل کر کل ہند ایجوکیشن کانفرنس قائم کی ۔ یہ کانفرنس غیر نصابی مذاکرے اور تعمیری جلسے منعقد کراتی تھی اور ایک ماہنامہ " العلم " کا اجراء بھی کیا جو کہ ہندوستان کے علمی حلقوں میں بہت زیادہ مشہور ہوا جنوری ۱۹۴۸ء میں پاکستان آنے کے بعد تحریک پاکستان کے سپاہی ہونے کا کوئی دنیاوی صلہ حکومت سے نہیں لیا بلکہ اپنے بڑے بھائی کے ہاں چھوٹے سے مکان واقع جیکب لائنز میں قیام کیا کچھ عرصہ کے لئے بغرض ملازمت گلگت تشریف لے گئے پھر کراچی دوبارہ تشریف لے آئے اور حسینی اسکول میں بحیثیت مدرس نونہالان وطن کو زیور علم سے آراستہ کرتے رہے۔

آپ ہمیشہ لوگوں کو درس دیتے تھے کہ علم سے بڑی کوئی چیز نہیں کیونکہ قرآن واحادیث سے ثابت ہے کہ جب خدا کسی بندے سے نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو علم دین عطا فرماتا ہے اور ایک عالم کی صحبت میں بیٹھنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے اور جاہلوں کے ساتھ بیٹھنا مزبلوں (کوڑا گھر) پر بیٹھنے سے بھی کم تر ہے ۔ علامہ مرحوم خاندانی ورثہ میں ملی ہوئی منکسرالمزاجی ، انسان دوستی ، خدمت خلق کے جذبے کے ساتھ مالی کمزوریوں کے باوجود کراچی کے میدان علم وادب میں کھل کر داخل ہوگئے اور بہت جلد بحیثیت سماجی رہنما ، ادیب شفیق استاد اور شعلہ بیان خطیب کی حیثیت سے مشہور ومعروف ہوگئے لوگوں کے اصرار پر آپ نے بنیادی جمہوریت کے انتخابات میں حصہ لیا اوربی ڈی ممبر کی حیثیت سے شاندار کامیابی حاصل کی ۔

آپ نے اتحاد بین المسلمین کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دیں ۔ آپ نے سید محمد دہلوی اور مفتی جعفر حسین کے ساتھ مل کر پورے ملک کا دورہ کیا اور پرجوش خطابات کے ذریعہ لوگوں کو اتحاد ، محبت ، صلہ رحمی ، ملک وقوم سے ہمدردی اور مسلمانوں میں اتحاد واخوت کا جذبہ پیدا کیا۔

۱۹۷۰ء میں آپ نے پریمئیر کالج میں اسلامک آئیڈیالوجی کے لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور ساتھ اردو ادب بھی پڑھاتے رہے کالج انتظامیہ نے آپ کے سابقہ علمی اور ادبی کارناموں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کی زیر ادارت مجلہ نکالا آپ نے اس مجلے میں اپنے جوہر دکھلائے ۔ آپ نے جامعہ کراچی میں بھی تدریس کے فرائض سرانجام دیئے اور جناح پوسٹ گریجویٹ کالج میں فقہ کی تعلیم دی ۔ آپ نے مختلف دینی اداروں میں واعظین کی تربیت کے بھی فرائض سرانجام دیئے۔

مرحوم پروفیسر ۱۹۹۰ء میں گورنمنٹ کے شعبہ تعلیم سے ریٹائر ہوئے آپ نے دینی تبلیغ کے لئے دنیا کے بہت سے ممالک کا دورہ بھی کیا آپ نے سعودی عرب میں جدہ کی ایک انجمن کی دعوت پر ۱۹۸۳ء میں مختلف شہروں میں تبلیغی اجتماعات سے کئی ماہ خطابات کئے ۔ آپ کی علمی اور اتحاد بین المسلمین کی تقاریر کو ہر مسلک اور فقہ کے افراد پسند فرماتے تھے۔

آپ نے رمضان المبارک سن ۱۹۸۵ء میں کینیا کے مختلف علاقوں میں تفسیر قرآن کے موضوعات پر خطابات فرمائے۔ ۱۹۸۸ء میں امریکہ کی مختلف ریاستوں میں مذہبی اجتماعات سے خطاب فرمایا اور سیر حاصل تبلیغ سے کافی طالبان علم کو علم کے زیور سے آراستہ کیا اور کافی غیر مسلموں کے دلوں کو اسلام کی حقانیت کی طرف مائل کیا۔ آپ نے دانشوروں ، علماء اور اسکالروں پر مشتمل ایک جماعت " مجلس ملی پاکستان " قائم کی جس نے انتہائی اہم اور منفرد موضوعات پر انتہائی جامع اور قابل قدر کتابیں شائع کیں

آپ ہر سال حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے علمی کارناموں پر سیمینار منعقد فرماتے تھے جس میں علمی شخصیت کے ذریعہ صدارت کے فرائض انجام دلاتے تھے۔ جن میں سابق گورنر سندھ جسٹس فخر الدین جی ابراہیم ، سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی احسان رشید ، سابق وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی پروفیسر کرار حسین اور مشہور وکیل اسرار حسین وغیرہ شامل ہیں۔

آپ کی علمی شخصیت ہونے کے باعث ہر صاحب اقتدار آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا رہا لیکن آپ نے ذاتی تعلقات کو ذاتی مفادات کے لئے استعمال نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ آپ ایک چھوٹے سے مکان میں عام شہری کی حیثیت سے زندگی گزارتے رہے اور اپنی عزت نفس کو پاکیزہ رکھا۔ علامہ پروفیسر مرحوم تقریباً تمام مذہبی ، ادبی اور سماجی رسائل میں جوہر قلم دکھلاتے رہے آپ کے علم حدیث ، تدوین فقہ ، توحید ، عدل ، سیرت النبیؐ اور سیرت آئمہؑ معصومین پر درجنوں مقالات اور مضامین شائع ہوئے۔ ۱۹۹۱ء میں انڈیا تشریف لے گئے اور وہاں علی گڑھ ، آگرہ اور بنارس میں مذہبی اور علمی اجتماعات سے خطاب کیا۔

آپ عارضہ قلب کے پرانے مریض تھے۔ قوت ارادی سے اس مرض کو دباتے رہے لیکن آخر مرض نے ۱۹۹۳ء تا اکتوبر ۹۴ کئی مرتبہ اثر دکھلایا آخر علم و عمل کا یہ چراغ جو دوسروں کو روشنی پہنچاتا رہا ۸ اکتوبر ۹۴ء کی شب گل ہوگیا۔ ۔۔ کے علمی حلقوں نے آپ کی وفات کو ایک عہد کے خاتمے سے تعبیر کیا۔ آپ کے تینوں صاحبزادے علم کی دولت سے سرفراز ہیں لیکن سب سے چھوٹے فرزند سلمان جلالوی اپنے والد کا پرتو ہیں۔ علامہ مرحوم علم ودانش ، سادگی ، خلق ، تقویٰ ، پرہیزگاری ، عجزوانکساری اور خلوص کے جو نقوش چھوڑ گئے ہیں وہ قابل تقلید ہیں۔

پیکرِ علم ودانش

پروفیسر سید محمد جعفر
سابق صدر شعبہ معاشیات جامعہ کراچی

۸ اکتوبر ۱۹۹۴ء رات کے ایک بجے مولانا سید عنایت حسین ہمیں چھوڑ کر خالق حقیقی سے جاملے انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ مولانا کا سانحہ ارتحال ایک ایسا قوی و علمی نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نظر نہیں آتی ۔ مولانا سید عنایت حسین صرف ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک اسلوبِ حیات کا نام ہے ۔ مثبت فکر ، ملک وملت کا درد ، علم وادب کے فروغ کی لگن ، حسن اخلاق ، عجزوانکسار اور یکسر محبت وایثار ان کی شناخت تھی ۔ وہ علی گڑھ کے ایک قصبہ جلالی میں پیدا ہوئے ۔ ابھی ان کی عمر صرف بارہ سال تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ یہ پہلا صدمہ تھا جس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا ۔ ہر چند ان کے ایک عزیز نے ان کی سرپرستی کے سلسلہ میں کوئی کمی نہیں کی اور ان کی تعلیم وتربیت پر پوری توجہ دی لیکن یہ سب کچھ باپ کی جدائی کے زخم مندمل نہ کرسکا البتہ اس دکھ نے ان کی شخصیت میں جو سوزوگداز پیدا کیا وہ آگے چل کر ان کی عظمت و بزرگی کے اجزائے ترکیبی میں ایک اہم جزو ثابت ہوا ۔ میر تقی میر نے ناکامیوں سے کام لینے کے جس سلیقہ کو بروئے کار لا کر اپنی زندگی کو روشن ومنور کیا تھا مولانا عنایت حسین نے بھی اس سلیقہ سے کام لیا انہوں نے اپنے دکھوں کے حوالے سے دوسروں کے دکھوں کو محسوس کرنا سیکھا جس سے ان کی شخصیت میں ہمدردی اور خلق خدا کی خدمت کا جذبہ بیدار کیا یہ ان کے اسی جذبے کی کارفرمائی تھی کہ زمانہ طالب علمی میں ہی انہوں نے اپنے اساتذہ اور اپنے ساتھی طالب علموں کے ساتھ مل کر کُل

ہند ایجوکیشن کانفرنس کی بنیاد ڈالی اور فروغ علم کے لئے عملی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اسی کانفرنس کے زیر انتظام "العلم" رسالہ کا اجرا کیا۔

مولانا مرحوم کو علم اور حصول علم سے جو گہری وابستگی تھی اس کا اندازہ ان کی تعلیمی سرگرمیوں سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ آپ نے نامساعد حالات کے باوجود ناظمیہ عربک کالج لکھنو سے ممتاز الافاضل کی سند حاصل کرنے کے علاوہ لکھنو یونیورسٹی سے دبیر کامل اور فاضل ادب کے امتحانات الہ آباد یونیورسٹی سے مولوی اور عالم کے امتحانات پاس کئے پاکستان آنے کے بعد پنجاب یونی ورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اس طرح دینی علوم کے ساتھ عربی اور فارسی زبانوں پر بھی قدرت حاصل کی۔

حصول علم کی لگن تو زندگی بھر ان کے ساتھ رہی اور انہوں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ مطالعہ کے لئے وقف کئے رکھا لیکن حصول علم کے ساتھ ساتھ انہوں نے درس وتدریس کے ذریعہ علم کی روشنی زیادہ سے زیادہ پھیلانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ انہوں نے مدرسی کو پیشے کے طور پر اپنایا۔ پاکستان آنے کے بعد کچھ عرصہ گلگت میں معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اس کے بعد کراچی آکر پہلے حسینی سکنڈری اسکول میں ملازمت کی اور بعد ازاں پریمیر کالج میں لکچرار کی حیثیت سے ملازم ہوگئے جہاں سے آپ بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر ریٹائر ہوئے۔ کراچی یونیورسٹی میں بھی تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ غرضیکہ ان کی پوری زندگی علم حاصل کرنے اور علم کو پھیلانے ہی میں بسر ہوئی۔

علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ آپ کی مذہبی اور تہذیبی سرگرمیاں بھی مسلسل جاری رہیں آپ ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ، شیعہ مطالبات کمیٹی اور ادارہ غلامان بوتراب کے اہم عہدوں پر نہایت خلوص اور حد درجہ ذمہ داری کے ساتھ کام کرتے رہے۔ مولانا سید محمد دہلوی اور مفتی جعفر

جیسے جید علماء آپ کے قریبی رفقاء میں شامل رہے ہیں ۔آپ مجلس ملی کے بانیوں میں سے ایک تھے اور اس مجلس کے پروگراموں میں بھرپور حصہ لیتے تھے ۔ مجلس ملی کے منشور میں پنجگانہ نماز کی پابندی ہر روز کم از کم آدھ گھنٹہ کسی دینی یا کسی اچھی کتاب کا مطالعہ ، ذاتی کردار کی تعمیر، ماہ بماہ اپنی آمدنی میں سے کچھ پس انداز کرنا اور سوتے وقت اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا شامل تھا یہ تمام نکات نہایت مثبت اور تعمیری سوچ کا نتیجہ تھے ۔

مولانا مرحوم کے کارناموں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا واقعی ان شخصیات میں سے تھے جن کے بارے میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے ۔

مت سہل " انہیں " جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

افسوس فلک کی برسوں کی گردش کے بعد خاک سے برآمد ہونے والا یہ شخص آخر کار خاک ہی کے بستر پر ابدی نیند سو رہا ہے ۔اب ہمارا یہ فرض ہے کہ اس نادر روزگار شخصیت کی غیر مطبوعہ علمی ، ادبی اور مذہبی تحریروں کو زیور طباعت سے آراستہ کرنے کا اہتمام کریں اور اس طرح ان کی غیر موجودگی کو موجودگی کی صورت دے کر ان سے استفادے کے عمل کو جاری رکھنے کی راہ ہموار کریں ۔ ان کی غیر مطبوعہ تحریروں کی اشاعت بلاشبہ ہم سب کے حق میں نیک شگون ثابت ہوگی ۔

اب ہمارے پاس ان کے احسانات کا بدل دینے کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ہم باری تعالیٰ سے دعا کرتے رہیں کہ وہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔ (آمین)

اس دورِ خرابات میں بے قدر تھا لیکن ۔۔۔۔۔ ؟

آل محمد رزمی

ہر باشعور وزندہ قوم اپنے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے اپنے علماء، واکابرین کے شاندار کارناموں کی بازیافت میں پناہ لیتی ہے اور اپنے عہد کے اہل فکرونظر، ارباب دانش، اکابرین اور علماء سے اپنا رشتہ و تعلق برقرار رکھتی ہے اور وہ قوم اس وقت قعرمذلت میں گر جاتی ہے جب وہ اہل علم سے اپنا رشتہ توڑ دیتی ہے اور ان کی علمی خدمات وقربانیوں سے بیگانہ ہوجاتی ہے ۔ ہماری قوم بھی کچھ اسی قسم کی بیگانگی وغیر ذمہ داری کا شکار ہے ۔ ہم اپنے ان مخلص و حقیقی علماء سے بہت دور ہوچکے ہیں جو مذہب کو تجارت نہ بنانے کی وجہ سے دولت وشہرت سے محروم رہے جو تبلیغ دین کو اپنا منصبی فریضہ سمجھ کر اقامت دین کے لئے تاحیات کوشاں رہے ۔ انہی مخلص ومعتبر لوگوں اور خاصان خدا میں ایک نام جناب پروفیسر مولانا سید عنایت حسین جلالوی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا بھی ہے ۔ جو اپنی ذمہ دارانہ خطابت سے گذشتہ نصف صدی عامتہ المسلمین کی صحیح سمت رہنمائی کرتے رہے اور مومنین کو ذہنی تعیش فراہم کرنے کے بجائے اصلاح احوال کی کوشش کرتے رہے ، اپنی روشن تحریروں سے اپنے عہد کو تاحدِ بصیرت منور فرماتے رہے ۔

تعلیمی اداروں میں اپنے لکچروں کے ذریعے قوم کے شعور فردا کو جہالت کی تیرگی سے نکال کر علم کی روشنی عطا کرتے رہے اور اپنے کردار و عمل سے قوم کے نونہالوں اور جوانوں کو متاثر کرتے رہے مولانا عنایت حسین جلالوی اعلیٰ اللہ مقامہ کے تقویٰ وتقدس ، علم وعمل ، زہد و عبادت ، خدا ترسی وخدا خوفی سادگی پرہیز گاری ، اخلاق وشرافت نے ہر مکتبہ فکر کے

لوگوں اور خصوصاً اہل نظر کو متاثر اور اپنی طرف متوجہ کیا۔

مولانا عنایت جلالوی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کو اہلبیت الطاہرین علیہم السلام سے بے پناہ ارادت و عقیدت ومحبت ومودت تھی، ان کے عقائد روز روشن کی طرح عیاں تھے وہ اہلبیت الطاہرینؑ سے اپنی وابستگی کو اپنے لئے دنیاو آخرت کی نجات کا سبب سمجھتے تھے اور ان ذوات مقدسہ سے ان کی عقیدت محض رسمی نہ تھی بلکہ ان کمالات علمی وروحانی اور ان کے اوصاف حمیدہ و صفات جلیلہ کی وجہ سے تھی۔

مولانا عنایت جلالوی کا شمار ان علماء ومفکرین میں ہوتا ہے جو ہمیشہ قوم کے مسائل پر باآواز بلند بولتے رہے اور ان کی فکری ونظری آبیاری کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کوشاں رہے۔

وہ عہد طالب علمی سے ہی ایک حساس ذہن کے مالک تھے اور قوم کا درد رکھتے تھے لکھنو میں قیام کے دوران انہوں نے آقائے شریعت حجتہ الاسلام مولانا کلب عابد صاحب قبلہ طاب ثراہ، مولانا مرتضی حسن فاضل لکھنوی مرحوم، ڈاکٹر مجتبیٰ حسین کامونپوری وغیرہ کے ساتھ ملک کر کل ہند ایجوکیشنل سوسائٹی قائم کی جس کے اغراض ومقاصد میں تعلیمی اقدار کا فروغ اور طالب علموں کو دین کے حقیقی مدعا و مفہوم سے آگاہ کرنا اور طالب علموں کی غیر نصابی سرگرمیوں کے لئے ایک مرکز فراہم کرنا تھا اور اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لئے ماہنامہ "العلم" کا اجراء بھی فرمایا۔

مولانا اپنے زمانہ طالب علمی میں جہاں جہاں رہے فعالیت آپ کا طرہ امتیاز رہی آپ بنارس اور لکھنو کے قیام کے دوران علمی اور فکری محاذوں پر مجاہدانہ طور پر سرگرم رہے۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان تشریف لائے اور کراچی کو اپنا وطن ثانی قرار دیا اور کراچی کی قومی سرگرمیوں میں ہجرت سے لحد تک مصروف رہے۔

۸ برس تک علامہ سید محمد رضی مجتہد دام مجدہ اور فاضل مشرقیات مولانا مرزا محمد جعفر مدظلہ کے ساتھ فروغ علم کے لئے کوشاں رہے اور درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔

کراچی کے علاوہ مولانا مرحوم شمالی علاقہ جات میں بھی مکتب تشیع کی ترویج و تبلیغ فرماتے رہے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ تک کراچی کے پریمئر کالج میں بطور پروفیسر تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ اس عرصہ میں آپ نے نئی نسلوں کو پاکستان کے نظریئے ، اس کے مقاصد ، اسکی ضرورت ، تاریخ اور روایات اور اس کے عالمگیر مشن سے آشنا کیا ۔ نوجوانوں کے اندر اتحاد بین المسلمین اور سالمیت و وحدت اور یکجہتی کے احساس کو ابھارا ، افتراق و انتشار کے خطرناک رجحانات و مضر اثرات سے آگاہ کیا ۔ اسلامی فکر رکھنے والے نوجوانوں کی تعداد ، استعداد ، صلاحیتوں میں اضافے کے لئے کوشاں رہے ۔ پریمئر کالج میں ۱۹۷۸ میں یومِ حسین کے موقع پر آپ نے اپنی ایک تقریر میں فلسفہ مذہب کے بنیادی اصولوں کی وضاحت اس طرح فرمائی ۔

" جن لوگوں نے مذہب اور اس کے متعلقات خصوصاً مذہبی جذبات واحساسات اور اس کی نوعیت کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ اللہ کی اس سنت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جس قدر کسی مقدس چیز سے ناجائز فائدہ اٹھانا سہل اور آسان ہے اسی نسبت سے یہ ناجائز انتفاع مہلک بھی ثابت ہوتا ہے ۔ خداوند عالم یہ کبھی گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کے پاکیزہ نام پر لوگوں کو دھوکا دیا جائے۔ چنانچہ جو افراد مذہب کے نام پر مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں اور مذہب کے گلشن میں فرقہ پرستی کا شجر اگاتے ہیں اور محض دنیاوی فائدوں کے لئے مسلمان کو مسلمان سے لڑاتے ہیں وہ خدا کے بھی مجرم ہیں اور معاشرہ کے بھی ۔ کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے خدا کے دین کی سربلندی ، قرآنی تعلیمات کے فروغ ، شریعت کی بالادستی اور

اخلاقی وانسانی اقدار کے تحفظ کے لئے قربانی دے کر مذہب کی معنویت واہمیت کی تشریح کی تھی ، کربلا میں مذہب کی آڑ میں اسلام کی بیخ کنی کا جو ڈرامہ یزید نے رچایا تھا ، امام عالی مقام نے اس کا پردہ چاک کر دیا اب یہ ہماری کوتاہ نظری ، عاقبت نا اندیشی ، عدم تدبر اور جذباتیت ہے کہ ہم مذہب کے نام پر اپنی اور اپنے اعزہ واقربا ورفقاء کی قربانی دینے والوں اور مذہب کے نام پر مسلمانوں کو دھوکا دینے والوں میں کوئی فرق محسوس نہ کرسکیں۔ " مولانا عنایت جلالوی مرحوم کے انداز بیان کی مفکرانہ عظمت اور مجتہدانہ خصوصیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔آپ اتحاد بین المسلمین کے داعی تھے آپ کی تقریریں ہمیشہ عصبیت سے پاک ہوتی تھیں آپ اسلام کے عالمگیر نظام کے مبلّغ تھے ایک تقریر میں اسلام کی اہمیت اور عظمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں " اسلام سچا ، الہامی ، فطری اور عقلی دین ہے جس میں جہانِ بشریت کے لئے مکمل ہدایات موجود ہیں اور انسانی زندگی کے لئے صلاح وفلاح کا پیغام ہے لہذا وہ ساری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے یہ کسی خاص نسل ، وطن ، مذہب یا فرقہ کے لئے نہیں نہ لسانیت ، نسلیت اور وطنیت کے ساتھ گندھا ہوا ہے ۔"

مولانا گذشتہ چالیس سال سے قوم میں انقلابی فکری تبدیلیوں کے لئے سعی پیہم فرماتے رہے ۔آپ نے قوم کے علمی وفکری ارتقاء کے لئے اور اس میں مشاہدے ومطالعے کا ذوق پیدا کرنے کے لئے " مجلسِ ملی " کی بنیاد رکھی ۔ جو تقریباً ربع صدی تک فعال رہی اس کے زیر اہتمام ہر ماہ علمی وفکری نشستیں منعقد ہوتی تھیں جس میں سید محمود الحسن رضوی ، ڈاکٹر سید ندیم الحسن نقوی مرحوم ، پروفیسر غلام عباس ، کاظم نقوی ، حسن جعفر ، رضی عسکری تقوی ، حمادزیدی ، قمر عباس ، پروفیسر علی امام رضوی ، پروفیسر سبط جعفرزیدی ، سید رشید حیدر رضوی ، ابوالحسن مفکر ، مختار احمد فاضل اور ناچیز

آل محمد رزمی شرکت کی سعادت حاصل کرچکے ہیں ۔ مجلس ملی کے زیر اہتمام جامعہ امامیہ میں متعدد سمینار بھی منعقد ہوئے ، ہر سال پابندی سے مجلس ملی کی جانب سے عید ملن پارٹی کا بھی اہتمام کیا جاتا رہا ۔ لیکن مجلس ملی کا اصلی کارنامہ وہ کتابیں ہیں جو مختلف موضوعات پر مولانا عنایت حسین جلالوی کی نگرانی میں شائع ہوئیں ۔

مجلس ملی ایک علمی ، فکری اور نظریاتی ادارہ تھا جس کی فعالیت اہل فکر ونظر کے تغافل و چشم پوشی اور عدم دلچسپی کی وجہ سے اب نہ ہونے کے برابر ہے لیکن اس کی اہمیت وافادیت ہمیشہ برقرار رہے گی ۔ مجلس ملی کو فعال بنانے میں جہاں پروفیسر مولانا عنایت حسین جلالوی کی کوشش شامل ہے وہیں معروف دانشور سید محمود الحسن رضوی ، ڈاکٹر سید ندیم الحسن نقوی مرحوم اور پروفیسر غلام عباس صاحب کا خون جگر بھی شامل ہے ۔

پروفیسر مولانا عنایت حسین جلالوی اعلی اللہ مقامہ اپنی نیکیوں سمیت اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رخصت ہوئے ۔ اب تخلیق کا اسمِ اعظم بھی ، ہماری خواہشوں اور دعاؤں کے باوجود انہیں مادی پیکر میں واپس نہیں لاسکتا اور ان کے سلسلے میں ہر دست دعا اور ہر حرف دعا بے مدعا اور نوحہ بن کر رہ گیا ہے ۔ وقت گذر جاتا ہے لیکن اس کی یادیں افق ذہن پر ستارہ صبح کی طرح جھلملاتی رہتی ہیں مولانا مرحوم اپنی یادوں کے پیکر میں ، اپنے علمی آثار ، اپنے علم وفضل اور کردار وعمل کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے ۔ اس بوڑھے مجاہد اور باعمل عالم کا جسم ضرور خاکی تھا لیکن ان کی روح نورانی تھی ۔ وہ مادی جسم کی سرحدوں سے گزرکر اور موت کا قرض چکا کر دائمی زندگی کی وادی میں قدم رکھ چکے ہیں یوں تو سینکڑوں سوگواروں نے دل گرفتہ ، گریۂ نمناک اور چشم خونبار کے ساتھ انہیں اپنے کاندھوں پر سوار کرا کر رخصت کیا اور لحد میں رکھ کر واپس آگئے ، اس سے آگے کا سفر

اس نیک نفس انسان نے اپنی نیکی کی بیساکھیوں کے ذریعہ طے کیا ۔ ابرق ساعت موجود کے ترشے ہوئے تابندہ حروف ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ فنا اور بقا کے رشتے اپنی حدود تک محصور و محدود ہیں ۔ بظاہر فنا ہونے والا وہ شخص کتنا عظیم ہے کہ ان کی شخصیت کا صحیح معنوں میں ادراک رکھنے والے اور ان کو ماننے اور چاہنے والوں کو اپنا وجود بے اثر لگ رہا ہے ۔ ریگ امروز پر مغموم ہوا نے یہ کیسا نوحہ لکھا ہے کہ ہر سننے والا اداس ہو گیا ہے ، یہ غم ایک ایسے بوڑھے مجاہد اور مرد جلیل کا ہے جس نے عہد طالب علمی سے لحد تک تقریر و تحریر کے ذریعہ دنیا پر دین کی برتری قائم کرنے کی کوشش کی ۔ قوم کی عصری تقاضوں کے مطابق نظری و فکری طور پر آبیاری کی ۔ قوم کے شعور فردا کی تعلیم و تربیت فرمائی ، قوم کی علمی سطح میں اضافہ کے لئے مجلس ملی کی بنیاد رکھی ، مجالس کی وساطت سے سید الشہداء علیہ السلام کی شہادت کے مقاصد پر روشنی ڈالی اور ذکر حسینؑ کو فن کے بجائے عبادت اور مذہبی تجارت کے بجائے سعادت و توشۂ آخرت سمجھا ، اور ہمیشہ ہمیشہ حصول زر کی لگن اور شہرت سے دور رہے ۔ " آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے ۔ "

اگرچہ اس مختصر سے مضمون میں مولانا مرحوم کی دینی خدمات اور علمی شخصیت اور ان کے انسانی اوصاف کا احصاء واحاطہ وادراک نہ ہو سکا ، مجھے اپنی قلمی بے مائیگی و تہی دامنی کا احساس بھی ہے اور افسوس بھی ۔ ذاتِ واجب مرحوم کو جوار سید الشہداءؑ میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے مراتب کو بلند فرمائے اور ان کے جملہ متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور عزیزم سلمان حسین کی توفیقات میں اضافہ فرمائے جو خطابت کے افق پر بتدریج طلوع ہو رہے ہیں ان کا یہ طلوع ہمارے لئے باعث طمانیت ہے ۔ پروفیسر سید عنایت حسین جلالوی کے علمی وارث و جانشین کی حیثیت سے ہمیں مستقبل میں ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں ۔ امید ہے کہ وہ خطِ مولانائے مرحوم پر چلتے

ہوئے لفظوں کے فانوس روشن کرنے کے ساتھ ساتھ خطابت کی معنویت و مقاصد اور مرحوم کے مشن کو بھی پیش نظر رکھیں گے یہاں خلوص دل کے خراج کے طور پر چند اشعار بطور ہدیہ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں ۔

بوذر صفت انسان تھا ، منبر کی ضیا تھا
کردار میں وہ سارے زمانے سے جدا تھا
اس دورِ خرابات میں بے قدر تھا لیکن
جو جتنا سمجھتا ہے وہ کچھ اس سے سوا تھا
عالم تھا ، مفکر تھا ، مدرس تھا ، عنایتؔ
اور کوہِ معانی کی بلندی پہ کھڑا تھا
مذہب کو کبھی اس نے بنایا نہ تجارت
اس واسطے وہ سارے زمانے سے برا تھا

"اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا"

سید کاظم حسین
سابق چیف سیکوریٹی آفیسر بینک دولت پاکستان

میں نہ کوئی خطیب ہوں ، نہ مقرر اور نہ ہی ادیب دل چاہتا ہے کہ مولانا سید عنایت حسین جلالوی مرحوم کی خدمت میں الفاظ کی شکل میں نذرانہ عقیدت پیش کروں ۔ اگرچہ میری اور ان کی ملاقات صرف دو دہائیوں پر محیط تھی ۔ میری اور مولانا مرحوم کی ملاقات میرے عظیم دوست شہید ڈاکٹر سید ندیم الحسن کے ذریعے سے ہوئی جب کہ مجلس ملی کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی ۔

۸ اکتوبر وہ منحوس دن تھا جب ایک عظیم شخصیت ہم کو داغ مفارقت دے گئی اور علم ودانش کا ایک باب ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا ۔ یہ شخصیت محترم مولانا سید عنایت حسین جلالوی مرحوم کی تھی ۔ جو نہ صرف اپنی ذات میں ایک انجمن تھے بلکہ خطیب بے مثال ، پیکر خلوص ووفا ، اساتذ الاساتذہ اور عالم باعمل تھے جو اپنی ذات میں فہم وفراست اور علم ودانش کا ایک ایسا خزانہ رکھتے تھے جس کے موتی وہ ہر وقت مخلوق خدا پر لٹاتے رہتے تھے ۔

مولانا مرحوم اپنی ذات میں ادارہ تھے اور اس ادارے کے دروازے ہر خاص وعام کے لئے ہر وقت کھلے رہتے ۔ وہ انتہائی مخلص ، ملنسار ، عالم باعمل اور شفیق انسان تھے اور ہر شخص کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے لیکن کسی دوسرے سے امید نہیں رکھتے تھے ۔ آپ کی ہمیشہ یہ کوشش

رہی تھی کہ آپ کی ذات سے عوام الناس کو فائدہ پہنچے ۔ آپ حضرت امام حسینؑ کا یہ قول اکثر دہراتے رہتے کہ " اہل حاجت کا تمہاری طرف رجوع کرنا خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور اس نعمت کے شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے کام آؤ" ۔

اپنی اصول پسندی ، وضعداری ، منکسر المزاجی اور انسان دوستی کے سبب وہ طلباء واساتذہ میں یکساں مقبول تھے اور نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں میں طلباء کی بھرپور رہنمائی کرتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ پریمئیر کالج کے اساتذہ میں ان کا منفرد و معتبر مقام تھا ۔ ان کے شاگرد آج نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جو یقیناً مولانا کے علمی کمالات کی نشانیاں ہیں ۔

مولانا صاحب اتحاد بین المسلمین کے زبردست داعی تھے آپ کی تقاریر و مجالس ہر مکتب فکر کے افراد کے لئے ہوتی تھیں اور ہر فقہہ کا شخص آپ کی تقاریر سے استفادہ کرتا تھا ۔ آپ کی تقاریر نے علم وآگہی اور معرفت و حقیقت کے انمول موتی بکھیرے اس سلسلے میں جدہ کی ایک مذہبی انجمن کے دعوت پر ۱۹۸۳ء میں سعودی عرب تشریف لے گئے جہاں حج اکبر ادا کیا ۔ پھر سعودی عرب کے مختلف شہروں میں دو مہینے تک مذہبی اجتماعات سے خطاب کیا ۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ء میں رمضان المبارک کے محترم مہینے میں کینیا تشریف لے گئے جہاں آپ نے قرآن کریم کی تفسیر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ فقہی مسائل بھی بیان کیئے ۔

مولانا مرحوم محبِ اہل بیتؑ تھے ۔ اہل بیتؑ سے ان کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بیماری کی حالت میں جب کہ ڈاکٹروں نے انہیں مکمل آرام کی ہدایت کی تھی اس کے باوجود عراق وایران کا موسم گرما میں جب کہ وہاں پر انتہائی سخت گرمی تھی سفر کیا اور زیارات کا

شرف حاصل کیا۔ مولانا ظفر حسن صاحب کے انتقال کے بعد جامعہ امامیہ کی سرپرستی فرمائی اور اس کو چار چاند لگائے۔

مولانا مرحوم تحریر کی عظمت اور اس کی اثر پذیری سے بخوبی واقف تھے یہی وجہ ہے کہ تقریر کے ساتھ ساتھ آپ نے علمی و تحریری کام کرنے کے لئے آج سے بیس برس قبل مجلس ملی پاکستان کے نام سے دانشوروں ، وکلا، علماء ، پروفیسرز اور ڈاکٹرز کی جماعت تیار کی جس نے انتہائی منفرد موضوعات پر جامع کتابیں تحریر کیں ۔ اس جماعت کے زیر انتظام ہر مہینے مختلف علمی و مذہبی نشستیں منعقد کیا کرتے تھے جس میں مشہور ومعروف اسکالرز مختلف علمی موضوعات پر خطاب فرمایا کرتے تھے ۔

کالج کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد مولانا مرحوم ۱۹۹۱ء میں انڈیا تشریف لے گئے اور یہ دورہ ہندوستان میں ۳۰ برس کے طویل عرصہ بعد ہوا ۔ انڈیا سے واپسی کے بعد ان کی طبیعت ناساز رہنے لگی ۔ وہ پچھلے ۲۵ برسوں سے دل کے مریض تھے ۹۴ ۔ ۱۹۹۳ء کے دوران وہ چار مرتبہ امراض قلب کے قومی ادارے اور لیاقت نیشنل ہسپتال میں داخل ہوئے ۔ ۸ اکتوبر کی شب ۱۱ بجے ان کی طبیعت خراب ہوئی جو کچھ دیر بعد سنبھل گئی ، پھر ایک بجے شب دوبارہ سینے میں شدید تکلیف کی شکایت کی اور رات ایک بج کر ۴۰ منٹ پر داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے انتہائی سکون وعافیت کے ساتھ اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی اور یوں پیکر علم ودانش ، فہم وفراست ، ایثار وخلوص اور انسان دوستی کا نقیب اور اتحاد بین المسلمین کا داعی ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑ گیا۔ بقول شاعر

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

قلم گویا ہوا ہے یوں

ماصرہ گوہر عابدی

آج کے اس نفسانفسی کے دور میں بھی معدودے چند افراد ایسے ہیں کہ جنہیں دست قدرت نے خلوص ومحبت ، ایثاروانکسار کے ایک مکمل پیکر کے طور پرتراشا ہے اور جب اس ضمن میں پروفیسر مولانا عنایت حسین جلالوی مرحوم کاذکر آتا ہے تو میں وہ الفاظ نہیں پاتی ہوں کہ ان کی علمیت ، بردباری اور خدمت خلق کااظہار کرسکوں ۔ بلاشبہ ان کو قدرت نے حسن وجمال ، وجاہت اور جمالیاتی ذوق سے بھی مکمل طور پر نوازا تھا اور انکو ایک آئیڈیل شخصیت کے طور پر بھی اپنی زندگی سنوارنے کیلئے رہبر ورہنما تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ان کی شخصیت اور وضع داری کچھ یوں تھی ۔

تصنع سے بری ہے حسن سادہ
لباس گل پہ گل بوٹے کہاں ہیں

پروفیسر صاحب جنہیں میں "چچا جان " کہتی تھی ان کی کتاب زیست کے ابواب اتنے اور اس قدر طویل ہیں کہ تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ناممکن نظر آتا ہے ہاں ! اتنا ضرور ہے کہ ان سے میرا ایک رشتہ نہیں تھا بلکہ کئی رشتوں نے مجھے ان کے بہت زیادہ قریب کردیا تھا۔ مرحوم ایک عالم دین ہونے کے علاوہ ادب کا بھی کافی ذوق رکھتے تھے اور ہردلعزیز پروفیسر تھے۔

چچا جان نے جلالی (علیگڑھ) سے لیکر کراچی تک علم وفضل کے حصول کے لئے طویل مسافت اختیار کی اس دوران وہ لکھنو میں بھی کئی برس تک قیام پذیر رہے اپنے وقت کے مشہور ومعروف مدارس اور درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہوئے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ایک

معروف ہردلعزیز پروفیسر اور ممتاز عالم دین ہونے کے باوجود انکساری کے جذبے سے سرشار تھے بہت ہی مختصر دورانیہ کی ملاقات کے دوران بھی خاطر مدارات ان کا شیوہ تھی اور انتہائی اصرار سے بغیر کھانا کھائے واپس نہ آنے دیتے تھے۔

بااصول ، انتہائی پروقار اور بردبار شخصیت کی بناء پر مختلف قسم کی محافل میں منفرد اور نمایاں حیثیت سے پہچانے جاتے تھے کسی ناگوار بات پر بھی رد عمل کچھ اس طرح کا ہوتا تھا کہ کسی دوسرے فرد کو تکلیف نہ پہنچے اور تحمل کا مظاہرہ کرتے تھے۔

زمانہ تدریس جو ایک طویل دور ہے ، ۲۰ سال کی محنت اور کوشش جس کی بناء پر پریمیر کالج اور جامعہ کراچی کے ہزاروں طلباء وطالبات کے شفیق استاد رہے نہ صرف تعلیمی بلکہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی تمام قسم کی معاونت سے طالب علموں کو مستفید کرتے رہے۔

مرحوم انتہائی خوش اخلاق اور بہترین اوصاف کے مالک تھے زندگی کا ایک طویل دور جو اصولوں پر مبنی تھا جو کہ کسی بھی فرد کی زندگی سنوارنے کیلئے باعث تقلید ہے۔ اپنی ذات میں ایک مکمل ادارہ جہاں پر کوئی بھی انسان مفید مشورے حاصل کرسکتا تھا کبھی بھی کسی فرد سے سختی سے نہیں پیش آئے اگر ان کے پاس دشمن بھی کسی کام سے جاتا تو اسکی بھی کسی نہ کسی طریقے سے مدد کرنے کی کوشش کرتے تھے اس لئے کہ ان کا مقصد حیات ہی دوسرے انسانوں کی خدمت اور بھلائی تھا۔ نیکی کرنے کے بعد کبھی بھی اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔چچا جان سینکڑوں افراد کے محسن تھے لیکن خود کبھی کسی کا احسان نہیں لینا چاہتے تھے۔ ہجرت ۱۹۴۷ء کے بعد سے ایک انتہائی نامساعد حالات کا دور انتہائی جانفشانی اور صبر و تحمل کے ساتھ گزارا اور ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے ، حقوق العباد کی ادائیگی

میں بھی چچا جان کا کردار انتہائی فعال رہا ہے۔

۱۹۷۳ء کے اوئل میں جب میں نے عملی زندگی میں قدم رکھا، بہو کی حیثیت سے میں چچا جان کی شخصیت سے بے پناہ متاثر ہوئی ان کا علم، ادب سے لگاؤ، شائستگی اور وضع داری نے رفتہ رفتہ مجھ کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔ چچا جان کے گھر میں جب بھی میرا جانا ہوتا میں خلوص ومحبت کی وسعتوں کے حصار میں دانشمندانہ باتوں سے بہت متاثر ہوتی تھی ۔ چچا جان کا ایک مخصوص لہجہ ان کی مسکراہٹ اور مدبرانہ ہدایتیں میرے لئے مشعل راہ بنتی چلی گئیں اور پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے شاہراہ حیات کے نشیب وفراز میں ان کی ذات میرے لئے ڈھارس کا باعث ہے اور پھر میں جب بھی ان سے ملی تو شفقت ومحبت کے سائبان تلے میں وہ تصور بھول گئی جو کہ " بابل کی گلیوں سے دور " جنم لیتا ہے اس کے نقوش مٹتے چلے گئے اور اس کی جگہ ایسا لگتا تھا کہ شفقت پدری نے لے لی اور میں پھر انتظار کرتی تھی ان دنوں کا کہ چچا جان کے گھر کب جانا ہوتا ہے ؟ اور پھر میں ان کو اپنے بچوں کی تعلیمی ترقی کے بارے میں بتاؤں کیونکہ ایسا کر کے مجھے دلی تسکین ہوتی تھی ۔ چچا جان بچوں کی شاندار کامیابی پر بے پناہ خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے ایک عالم فاضل شخصیت کی طرف سے بچوں کی حوصلہ افزائی انکو مزید کامیابی اور کامرانی کی راہ دکھاتی تھی اور بچے مزید لگن اور محنت سے تعلیمی میدان کے لئے سعی کرتے تھے۔

اب میں آرہی ہوں اس نکتہ کی طرف جو میرے لئے دلچسپی کا باعث بھی تھا اور میرے لئے ایک ایسا خواب تھا جو کہ اب تک شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا لیکن میں نے چچا جان سے اس کے بارے میں رائے لے لی تھی اور انہوں نے حسب عادت مجھے مطمئن کیا اور تعاون کرنے کیلئے بھی کہا لیکن میں باوجود کوشش کے اس پروجیکٹ کو مکمل نہ کرسکی وجوہات اس کی یہ

تھیں کہ گھریلو زندگی کے مسائل اور بچوں کی تعلیم وتربیت پر بھرپور توجہ کے باعث میں اپنے منصوبہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکی وقت گزرتا چلا گیا۔

ایک شام میں اپنے شوہر حامد صاحب اور بچوں کے ہمراہ چچا جان کے یہاں گئی اور ایک موقع پر دوران گفتگو میں نے ان سے کہا چچا جان ! میرا شعری مجموعہ جس کا نام " صدف گوھر " رئیس امروہوی صاحب مرحوم کا تجویز کیا ہوا ہے ، اس کو میں جلد سے جلد مکمل کرنا چاہتی ہوں اس کی تقریب رونمائی کے لئے جامعہ کراچی سے دانشور اور دوسرے علماء کی شرکت ممکن ہے ؟ پروفیسر صاحبان کی آمد اور تقریب سے متعلق اہم امور پر بات چیت کرنے کے لئے چچا جان نے مجھے انتہائی تسلی بخش جواب دیا لیکن میں اب تک مجموعہ کو اس پوزیشن پر نہ لاسکی کہ جس کی تمنا تھی اور اب جب کہ چچا جان ہمیں اپنی جدائی کا غم دے گئے تو میں نہیں سمجھتی کہ میں اس منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکوں۔

کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی چچا جان جیسے قابل اور شفیق استاد کی شاگردی میں ہوتی ۔ ابھی تو مجھے بہت سی ہدایات لینی تھیں ۔ میں نے چچا جان سے صحافت کے میدان میں آنے کے لے بھی استفسار کیا اور انہوں نے اثبات میں جواب دیا لیکن وہ ۲۶ سال کی پرانی " انجائنا " کی تکلیف جس کو بڑے صبر کے ساتھ علاج کراتے ہوئے جھیل رہے تھے وہ انتہا کو پہنچ گئی اور میں چچا جان کی کسی طرح بھی کوئی خدمت نہ کرسکی جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا ۔ دو سال سے چونکہ میں خود آرتھوپیڈک سرجن اور پھر نیورو سرجن کے زیر علاج رہی ہوں چچا جان سے حسب خواہش جلدی جلدی ملاقات نہ کرسکی لیکن اتنا ضرور ہے کہ میری شدید علالت کے دوران بھی انہوں نے مجھ سے اپنے گھر پر باتیں کیں میں ان کی کمزوری اور طبیعت کی خرابی پر بہت مایوس ہوچکی تھی اور آخر کار ۸ اور ۹ اکتوبر کی درمیانی شب چچا

جان نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا میں اپنی بیماری کے باعث فوراً نہ پہنچ سکی لیکن جس وقت میں نے ان کو جا کر خدا حافظ کہا۔ بیان سے باہر ہے۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ، شریف النفس ، منکسر المزاج ، عالم فاضل شخصیت کے سائے سے ہم سب محروم ہوگئے۔ صبر جن کا شعار تھا سفید پوشی کا بھرم رکھنے والے خوددار عظیم انسان یعنی میرے چچا جان اپنی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ ہونے والے تھے اور اسکے بعد " ہمارے سر سے محبت کا سائبان گیا۔"

مرحوم کتنے قابل اور محترم استاد تھے کہ اساتذہ بھی ان کے شاگردوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک بھرم تھا جو ہمیشہ قائم رہے گا ہزاروں سوگوار جو ان کے بغیر اپنے آپ کو بے سہارا سمجھتے ہیں اب علم وہدایت کی راہ دکھانے والے روشن چراغ سے محروم ہوگئے لیکن وہ علم وفضل کا خزانہ جو چچا جان ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ ہے ، رہنمائی کی وہ منزل ہے جہاں زندگی سنور سکتی ہے اور دنیا اور عقبہ دونوں میں سرخرو ہوا جا سکتا ہے۔

میرے بھائی ابا

سیدہ نزہت زہرا

ابتداء ہے خالقِ اکبر کے نام سے جس نے خلق کو ایجاد کیا ، جو کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ، اور جو موت وحیات کا مالک ہے اس کی صفات وکمالات کی کوئی حد معین نہیں وہ احسن الخالقین اور انسان احسن المخلوقات ۔

قرآن مجید کی آیت **لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم** کی رُو سے پروردگار عالم نے انسان کو بہترین ڈھانچے پر خلق کیا ، در حقیقت انسان کا انسان پیدا ہونا اظہارِ کمال خداوندی ہے اسی طرح ہر انسان کا انسانی تقاضوں کو پورا کرنا اور انسانی صفات پر باقی رہنا کمال انسانیت ہے یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کے لئے رشد وہدایت کے سلسلے جاری کئے تاکہ اس نورانی سلسلے سے ہدایت حاصل کرکے وہ اپنے ذہن وقلب کی تاریکی دور کرکے تسخیرِ کائنات کے حکم الہیٰ پر عمل کرسکے۔

کون اس حقیقت سے انکار کرسکتا ہے کہ انسانیت کی راہ دشوار اور کٹھن ترین ہے کہ ذرا بھی حدود سے باہر ہوا تو انسان زمرہ انسانیت سے نکل کر حیوانوں میں شمار ہونے لگے اکثر لوگ اپنے ہی قبیح افعال واعمال کے سبب سے اس گرانبہا دولت انسانیت سے محروم ہو کر حیوانیت کے قعر مذلت میں جاگرے ۔ سچ ہے کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

انسان جس دنیا میں سانس لے رہا ہے وہاں ہمہ وقت نیکی اور برائی کی کشمکش جاری ہے اور اسلام جو دین فطرت ہے کہ ہر پیدا ہونے والا اسی پر پیدا ہوتا ہے ، ہرگز رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا ، جنگلوں اور ویرانوں میں

نکل کر یاد الہیٰ کرنا کچھ اور ہے اور دنیا میں رہتے ہوئے معاشی ومعاشرتی ذمہ داریاں اور حقوق العباد وحقوق اللہ ادا کرنا کچھ اور اہمیت رکھتا ہے ۔ جہاد کی چھ اقسام میں سب سے افضل جہاد " جہاد بالنفس " ہے جو اس امر کا متقاضی ہے کہ خدا کا بندہ اس جہان رنگ وبو کا ایک حصہ ہے اور ایک جزو بن کر بھی یاد الہیٰ اور اپنے خالق سے غافل نہ ہو یا بالفاظ دیگر انسان دنیا کے تمام امور اور افعال انجام دے اور اپنی اور اپنے متعلقین کی تمام ضروریات واحتیاجات پوری کرے لیکن صرف اس طرح کہ اس کا کوئی فعل کوئی عمل شریعت سے متصادم نہ ہو ، جو اپنی خواہشاتِ نفسانی پر قابو پاتے ہوئے جہاد بالنفس کے معرکے طے کرتا ہے ، نیکی کی راہ پر گامزن رہتا ہے ، توفیق الہیٰ یقیناً اسی کے شامل حال ہوتی ہے کہ خود قادر مطلق کا وعدہ ہے کہ ہمارا بندہ ہماری طرف ایک قدم آئے ہم دس قدم اس کی جانب بڑھتے ہیں ، جہاد نفسانی کے جذبے سے سرشار نیکی کی راہ پر گامزن یہ وہی بندہ خدا ہے جو آدمیت سے بڑھ کر انسانیت کے مرتبہ پر پہنچا اور صرف انسان ہی نہیں بلکہ توفیق الہیٰ ، اپنے جہاد نفسانی اور تائیدِ ربی سے کامیاب ترین انسان بن گیا۔

ایک ایسا ہی انسان اگر صاحب علم بھی ہو تو کیا کہنا ! کیونکہ انسانیت کی معراج " علم " یہ علمدار عظمت " علم " سبب سرفرازی " علم " ، وسیلہ تسخیر کائنات " علم " گویا ساری عظمتیں اور سربلندی علم کی بدولت یہ علم ہی تو تھا جس کی بنا پر انسان کو ملائکہ پر فضیلت حاصل ہوئی اور مسجود ملائکہ بن کر اشرف المخلوقات ٹھہرا۔

علم ایسا وظیفہ و وسیلہ ہے جس کے لیئے مدینتہ العلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ " حصول علم میں وقت صرف کرنا ایک ہزار شہیدوں کے جنازوں میں شرکت سے بہتر ہے۔ " کچھ دیر علمی باتیں اور صاحبان علم کی صحبت ایسی ایک ہزار راتوں سے بہتر ہے جن راتوں میں ایک ایک ہزار

رکعات نماز بجالائی جائے " اور علم کی عظمت و سربلندی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ باعثِ تخلیقِ کائنات نے ایک عالم کی موت کو ایک عالم کی موت قرار دیا گویا رسولؐ یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ کسی عالم باعمل کی موت کو صرف ایک فرد کی موت نہ سمجھنا بلکہ درحقیقت یہ ایک دنیا کی موت ہے اور ہر وہ شے اس موت پر نوحہ کناں ہے جس کا واسطہ اور تعلق کسی بھی طور اس عالم باعمل سے رہا، لیکن ان کے حزن وملال و افسردگی اور غم والم کے جذبات کو نہ تم دیکھ سکتے ہو نہ سمجھ سکتے ہو نہ محسوس کرسکتے ہو۔

میرے بھائی ابا بلاشک وشبہ ایک ایسے ہی عالم باعمل تھے جن کی شخصیت ہمارے لئے بجا طور پر باعث افتخار ہے جن کی سیرت بلند، خیالات پاکیزہ جو زندگی کے ہر شعبے خواہ گھریلو زندگی کے امور ہوں یا مالی و معاشی وسائل، سیاسی ومذہبی معاملات ہوں یا خلق خدا کی خدمت، ناسازگار ماحول اور نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے حق وصداقت کی کٹھن راہ پر گامزن رہے، انسانیت کی ہر تعریف اور ہر معیار پر ہر اعتبار سے پوری اترنے والی شخصیت جو کسی کے رعب ودبدبے اور جاہ وجلال سے مرعوب نہ ہوئے جنہیں بڑے سے بڑے صاحب ثروت واقتدار کی آنکھوں کو خیرہ کردینے والی آب وتاب بھی ان کے اصولوں سے نہ ہٹا سکی۔ جنہوں نے کسی اہل زر کو اپنے راستے میں کھڑا دیکھ کر کبھی اپنی راہ نہ بدلی جن کی عاجزی میں تمکنت اور فقیری میں شاہی تھی جن کے پاس قوم وملت کے غموں کا مداوا موجود تھا جو اپنی ذات میں ملت پر اتنا خرچ ہوئے کہ نادار رہے۔ جن کے سینے میں قوم وملت کا اسقدر غم کہ ایک عارضہ بن گیا، جو ملت کیلئے اتنی روشن فکر اور بلند خیال رکھتے تھے کہ قومی تشخص کے حوالے سے چھوٹی چھوٹی برائیاں بھی ان کے لئے ناقابل برداشت تھیں، جو ہر لمحہ قومی ترقی کے خواہاں تھے جو یہاں تک سوچتے تھے اور کہتے تھے۔

" جتنا پیسہ ہم تبرک پر صرف کرتے ہیں اگر اس کا آدھا تبرک پہ صرف ہو اور آدھا قوم کی تعمیر و ترقی پر صرف کیا جائے تو قوم کا کوئی فرد جاہل اور محتاج نہ رہے اور مولاؑ کی زیادہ سے زیادہ حصولِ خوشنودی کا سبب بھی بنے۔"

یقیناً ایسی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کی ساری زندگی کا احاطہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ۔ کون شخصیت، جس کا نام نامی عنایت حسین گویا اسم بامسمیٰ، دنیا سے اٹھ گئی ۔ قوم مولا کی عنایت سے محروم ہوئی اور صرف ایک عہد کا ہی خاتمہ نہیں ہوا بلکہ حدیث رسولؐ کی رو سے ایک دنیا ختم ہو گئی ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ بقرہ ۱۱

جب احمدؐ مرسل نہ رہے کون رہے گا

مقالۂ خصوصی

جلالی کا بطلِ جلیل

سید محمود الحسن رضوی
سابق ڈائریکٹر جنرل محکمہ افرادی قوت و سکریٹری حکومت سندھ

کارلائیل کا خیال ہے کہ تاریخ عظیم ہستیوں اور شخصیتوں کے ایک سلسلہ کا دوسرا نام ہے۔ یہ بات بڑی حد تک سچ ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ عظیم شخصیتوں کے عظیم کارناموں کا ایک سلسلہ ہے۔ ایسی ہی عظیم شخصیتیں نابغہ کہلاتی ہیں۔ یہ اپنے عہد کی مخلوق ہوتے ہوئے بھی نئے عہد اور نئے انقلاب کی خالق ہوتی ہیں۔ یہ زمانہ کا مرکب نہیں بلکہ راکب ہوتی ہیں۔ وہ زمانہ سے سبق وعبرت ہی حاصل نہیں کرتیں بلکہ زمانہ کو ایک نئی نہج بھی عطا کرتی ہیں۔ ہر نابغہ عہد اپنے دور کے مزاج کا نباض ہوتا ہے اور اپنی دور بینی وبصیرت سے اپنے زمانہ کی خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کرکے فلاح وترقی کے راستے دکھاتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں سے فلاح ملت کا تصور پیش کرتا ہے۔ مولانا سید عنایت حسین جلالوی مرحومؒ بھی ایک ایسی ہی شخصیت کا نام تھا۔ جن کے بارے میں علامہ اقبالؒ کا یہ شعر صادق ہے کہ

دلم بہ دوش ونگاہم بہ عبرت امروز
شہید جلوہ فردا وتازہ آئینم

کسی بھی شخص کی عظمت کا راز اس کی شخصیت کے وقار اور اس کی خدمات کے نکھار میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ جس طرح پھول اپنی قدرتی مہک وجاذبیت اور شگفتگی وحسن سے ہر شخص کو متاثر کرنے کی خداداد صلاحیت

رکھتا ہے ، اسی طرح مرحوم بھی اپنے کردار کی رعنائی اور اپنی سیرت کی زیبائی میں حسن اخلاق کی وہ انفرادیت رکھتے تھے جس کی وجہ سے وہ جس کسی سے بھی ملے اسے اپنا مداح وگرویدہ بنالیا اور اپنی ذاتی عاجزی ، انکساری ، طبع کی روانی اور اعلیٰ فطری صلاحیتوں کی جولانی سے علم وادب اور دین ومذہب سے لگاؤ رکھنے والے ہر شخص کا دل موہ لیا۔ ان کی نورانی صورت ، دلنواز شخصیت اور دلفریب سیرت اس پر مستزاد تھی ۔ مولانا جلالوی نے مرنجان ومرنج طبیعت پائی تھی اس پر ان کی خاندانی وضع داری اور منسکر مزاجی ان کی عادت ثانیہ بن گئی تھی ۔ آپ ایک لائق وفائق استاد بھی تھے جو اپنے طلباء میں علم کے حصول کی لگن پیدا کرنے میں کمال رکھتے تھے۔ انکی شخصیت خلق ومروت اور خلوص ومحبت کا وہ دلکش پیکر تھی جس کی صحبت زنگ آلود فطرتوں میں بھی ایثار وعمل کی جلا پیدا کرکے انہیں خلق ومحبت کا مرکز بنا دیا کرتی ۔

مولانا جلالوی صاحب مرحوم ایک بلند پایہ خطیب ، علمی اور تہذیبی شخصیت تو تھے ہی لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ ملت کے غمگسار اور اسلام کے شیدائی تھے۔ سید القوم خادمہم کی مثال ان پر صادق آتی ہے۔ انہوں نے ملت جعفریہ کی خدمت اور مقصد حسینی کی تبلیغ کو اپنا وظیفہ حیات بنا لیا تھا۔ زرپرستی کے اس دور میں جب کے تبلیغ مذہب اور ذاکری کو بھی جلب منفعت کا ذریعہ بنالیا گیا ہے۔ مولانا کا اپنا انداز تھا کہ سینکڑوں مجلسیں پڑھیں اور لاتعداد نکاح پڑھائے لیکن نذرانہ قبول نہیں کیا ، حتیٰ کہ سواری کی بھی پرواہ نہ کی ، خود گئے اور خود آگئے۔ آپ دولتمند نہ تھے لیکن آپ کی فکر نے آپ کو " امیر " بنا رکھا تھا۔ بے پناہ دولتیں ، محلات ، بنگلوں اور کوٹھیوں کی پرآسائش زندگی ، گاڑیوں کی ریل پیل ، ڈالر اور ریالوں کی چمک دمک اپنی جگہ لیکن اصل دولت خود اعتمادی ہے۔ یہی " تونگری " اور " خودگری " ہے۔

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

اور ہم عام طور سے اسی دولت سے محروم نظر آتے ہیں۔ حق و باطل کی آویزش ہر دور میں جاری رہی ہے صرف نام بدلتے ہیں ، حقائق و مقاصد نہیں بدلتے۔ مولانا نے دولت سے لاپرواہ ہمیشہ حق کے لئے نبردآزما کسی صلہ وستائش کی تمنا کے بغیر اپنی زندگی مذہب حقہ کی خدمت میں بسر کی ۔ ایسے پابند صوم وصلواۃ لوگ کہاں ملتے ہیں ۔ بلاوا آیا تو آپ حج بیت اللہ اور زیارات مدینہ منورہ ، عراق وایران یعنی کہ چہاردہ معصومینؑ کی زیارتوں سے بھی مشرف ہوئے۔ ہشت پہلو تھا یہ مرد مومن پھر بھی شہرت کا طلبگار نہ تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دل کی بیماری شدت اختیار کر گئی اور آپ گوشہ نشین ہو کر رہ گئے۔ لیکن اس کے باوجود قومی معاملات اور پریشانیوں کی فکر دامن گیر رہی ۔

مولانا عنایت حسین جلالویؒ ایک ایسا معتبر نام جو مذہبی ، سماجی اور ادبی حلقوں میں احترام کی علامت بن گیا تھا۔ وہ ایک عالم ، مدرس ، جامعہ امامیہ اور مجلس ملی کے سربراہ اوران سے سب باوصف متقی ، دیانتدار ، پابند شریعت ، اصولی شخصیت جسے کسی قسم کی چمک متاثر نہ کر سکی اور نہ ہی کوئی اندیشہ وخوف انہیں جادہ مستقیم سے متزلزل کرسکا۔ جھکنے اور بکنے کا عنصر تو ان کے خمیر میں تھا ہی نہیں اور مصلحت اور منافقت تو کبھی قریب سے گذر ہی نہ سکی ۔ شرافت ، مروت ، محبت ، خلوص ، کشادہ دلی ، دوست نوازی ، نام ونمود سے بے نیازی اور قلندرانہ انداز ان کی شناخت رہا۔ اور اسی سے وہ قومی اور سیاسی حلقوں میں بھی انتہائی وضعدار رکھ رکھاؤ کے مالک ہردلعزیز ، محترم اور ساتھیوں کے لئے نمونہ عمل رہے۔ آج مرحوم کے پسماندگان اعزاء اور احباب ہی نہیں بلکہ ہر وہ شخص جس کا برائے نام ہی سہی

آپ سے ربط وتعلق رہا، دل ملول وسوگوار موصوف کی خوبیاں بیان کرتا نظر آتا ہے۔ آپ نے اپنے حسن سلوک، سادگی، مخصوص انداز تکلم اور رکھ کھاؤ سے ایک خلقت کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ تقدس، ورع، ذکاوت، دیانت متانت آپ کی پیشانی سے ٹپکتی تھی۔ مولانا مرحوم سے تقریباً چالیس برسوں سے زیادہ کی رفاقت، ایک مخصوص نہج پر ساتھ کام کرنے، بحث ومباحثے، مجلسوں، محفلوں، جلسے جلوس اور میٹنگوں میں شرکت کے طفیل آپ کی شخصت کے مختلف پہلوؤں سے کماحقہ شناسائی ہوئی۔ موصوف کی سادگی، سلاست روی، صاف گوئی اور معصومانہ انداز نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں مولانا کو کبھی کسی کی برائی کرتے ہوئے کسی نے نہ سنا ہوگا۔ غیبت کے عام مرض میں آپ کبھی مبتلا نہ ہوئے۔

مولانا جلالوی مرحوم سے میرا تعارف امام بارگاہ جٹ لینڈ لائنز کی سالانہ مجالس کے انتظامات اور ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ کی کارگزاریوں کے واسطے سے ۵۳ - ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ اسے فکر وعمل کی ہم آہنگی کہا جائے یا آپ کی شخصیت کا تاثر اور جاذبیت کی اتنی طویل مدت کے ساتھ اور کارکردگی میں شاید ہی کبھی الجھن پیدا ہوئی ہو۔ قومی معاملات میں ہم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ نظر آئے۔ اس دوران میں مولانا کی معاملہ فہمی، شرافت، غیرت ودلیری اور اخلاص عمل سے متعلق یادوں کی لاتعداد واقعات کی ایک کہکشاں ہے جو نظر کے سامنے ہے لیکن اس مجلے میں اتنی گنجائش کہاں کے سب کا تذکرہ کیاجائے۔

مولانا سید عنایت حسین جلالوی مرحوم یوم البدر ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۴۵ھ ممالک متحدہ آگرہ واودھ کے مغربی ضلع علی گڑھ کے مشہور قصبہ جلالی میں ایک ایسے علم دوست زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے جس پر مذہبی رنگ غالب تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب ہندوستان میں اسلام کے مبلغ اور مشہور

صوفی حضرت سید علی بن شہاب الدین ہمدانی کے توسط سے امام چہارم حضرت علی بن الحسین علیہ السلام زین العابدین تک پہنچتا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم جلالی میں حاصل کی اور ۱۹۳۹ء میں مدرسہ منصبیہ میرٹھ میں داخل ہوئے۔ وہاں سے لکھنو تشریف لے گئے۔ کچھ عرصہ بنارس کے دینی مدرسہ جوادیہ میں بھی تعلیم حاصل کی لکھنو کی مشہور دینی درسگاہ ناظمیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ کے استاد آل نجم العلماء مولانا سید محمد رضی مجتہد اور ہم جماعت حجت الاسلام سید محمد محسن نقوی مجتہد مدظہ العالیٰ ، مولانا مرزا محمد جعفر مدظلہ ، ممتاز الافاضل مولانا حکیم سید باقر حسنین زیدی مولانا سید محمد جعفر وسیم مرحوم ، مولانا غلام عسکری صاحب مرحوم بانی تنظیم المکاتب ، مولاناسید کلب عابد مرحوم ، مولانا غلام مہدی صاحب مرحوم مجتہد واگریجی ، مولانا آغا طیب جزائری صاحب ، مولانا سید سعید اختر رضوی (افریقہ) جیسے بزرگ علماء آپ کے مداح رہے اور آپ کی ذہانت وفصاحت کی تعریف کی ۔ قیام لکھنو میں آپ حافظ کفایت حسین مرحوم ، حجت الاسلام مفتی جعفر حسین مرحوم ۔ سربراہ ملت جعفریہ خطیب اعظم مولانا سید محمد دہلوی مرحوم ، مولانا کلب حسین مرحوم ، مولانا وزیر علی مرحوم ، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی اور دیگر جید علماء وخطباء سے قریب رہے۔ طالب علمی کے دوران تقریر وتحریر اور ایام عزاء میں مجالس پڑھنے کا آغاز کیا۔ نیز قومی درد اور خدمت ملی کے جذبہ کا اظہار بھی ہوتا رہا۔ آپ نے تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا۔

انجمن حسینی جٹ لائنزاور یادگار سالانہ مجالس

پاکستان آنے کے بعد زیادہ تر مومنین سرکاری کوارٹروں بالخصوص لائنز ایریا اور مارٹن روڈ میں قیام پذیر تھے۔ جٹ لائنز میں جناب نواب حسین دہلوی (ماموں نواب) مرحوم کے ایما پر " انجمن سپاہ حسینی) کی تشکیل عمل میں آئی اور مولانا مرحوم اس کے جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ دیگر ساتھی

اس کے فعال کارکن تھے ، اس انجمن کے زیر اہتمام ایام عزاء کی مجالس اور جلوس ہائے عزاء کے ساتھ شہید ثالث اور شہید رابع کے مزارات کے طرز پر سالانہ مجالس کی طرح ڈالی گئی ۔

ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ

مسلمانوں کو ہندوؤں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنے کی اس جدوجہد میں جسے تحریک پاکستان کہا جاتا ہے شیعان حیدر کرار نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کے ایک مخصوص گروہ نے جس میں اکثریت تحریک پاکستان کے مخالفین کی تھی پہلے سے سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت اس نوزائیدہ مملکت کو ایسے مکتب فکر کے مذہبی خول میں بند کرلینے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کے نظریہ اور قائد اعظم کی منشاء کے خلاف ان کے انتقال کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کے مذہب سے جذباتی لگاؤ سے فائدہ اٹھا کر دستور ساز اسمبلی سے قرارداد مقاصد منظور کرائی ۔ حکومت پاکستان نے قرارداد مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تعلیمات اسلامیہ بورڈ بنایا اور مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ مرحوم اس بورڈ میں شیعوں کے نمائیندہ مقرر ہوئے۔ مولانا عنایت حسین جلالوی مرحوم کو بھی اس بورڈ میں ملازمت دی گئی ۔ علماء کے اس بورڈ کے مباحثوں اور کاروائیوں نیز مذہبی فرائض ورسومات کی ادائیگی میں روڑے اٹکائے جانے اور مذہبی ریاست کے بڑھتے ہوئے تصور کے ساتھ فرقہ وارانہ انداز فکر نے جنم لینا شروع کیا اور وہ اتحاد عمل جو تحریک کے دوران مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں پایا جاتا تھا متاثر ہونا شروع ہوا تو شیعوں کو بھی حفظ ماتقدم کا احساس ہوا لہذا لاہور میں علماء وزعماء شیعان پاکستان کا ایک نمائندہ اجلاس منعقد ہوا اور شیعوں کے حقوق کی حفاظت کے لیئے ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ کی تاسیس عمل میں آئی ۔ مولانا سید عنایت حسین جلالوی مرحوم نے

اس ادارہ کے قیام اور اسے فعال بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

کراچی میں عزاداروں کو منظم کرنے والے کارکنوں کی ٹیم جسے اس ادارہ عالیہ کا بانی کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ مولانا سید عنایت حسین جلالوی مرحوم ، انوار حسین صاحب جعفری مرحوم ، مظہر عباس صاحب زیدی مرحوم ، صفدر حسین صاحب زیدی مرحوم ، سید علی نقوی صاحب ، شرف الحسن زیدی صاحب ، توکل حسین عابدی صاحب ، علی اوسط زیدی اور راقم الحروف پر مشتمل تھی ۔

ابتدائی دو دہائیوں میں اس ادارہ نے شیعان پاکستان کی وقیع خدمات انجام دیں کراچی میں قوم کے نمایاں افراد اس کے عہدیدار منتخب ہوتے رہے۔ ۔ ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کے کارکنوں نے کراچی میں فروغ عزاء ، مساجد وامام بارگاہوں کے لیئے قطعات اراضی کے الاٹمنٹ ، مجلسوں اور جلوسوں کے لیئے لاوڈ اسپیکر کے اجازت ناموں ، جلوس ہائے عزاء کے پرمٹوں کے حصول ، محرم کی تعطیلات میں اضافہ اور مذہبی فرائض اور رسومات کی ادائیگی میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

پریشانیوں اور مالی وسائل کے فقدان کے حوصلہ شکن حالات میں درج بالا افراد کے علاوہ دیگر بزرگ ساتھیوں کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے ادارہ سے مربوط رہ کر اپنے اخلاص عمل سے کراچی میں شیعت کے لئے مضبوط بنیادیں فراہم کیں ۔

ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ نے نہ صرف خالص مذہبی خدمات انجام دیں بلکہ ملکی اور مقامی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ اس جماعت کے نامزد افراد وزیر بھی ہوئے اور سفیر بھی ۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی کے پہلے میونسپل الیکشن میں مسلم لیگ سے دو ٹکٹ حاصل کرکے ادارہ نے گولیمار سے سید اسرار حسین ایڈوکیٹ مرحوم کو اور لالوکھیت سے حاجی غلام حسین جیٹھا بھائی گوکل

مرحوم کو کامیاب کرایا۔

مولانا مرحوم اور الیکشن

مولانا سید عنایت حسن جلالوی مرحوم کا الیکشن بڑا ہی دلچسپ اور حیران کن تھا۔ نہ بینر نہ پوسٹر نہ لسٹیں ، نہ دفتر نہ الیکشن کے دن شامیانے نہ پان نہ سگریٹ جب کہ مقابلہ میں دوسری طرف لاتعداد پیشہ ور کارکن ، قطار لگانے کے لئے کرائے کے ٹٹو ، شامیانے ، کرسیاں ، میزیں ، دفاتر اور بینروں کی بھرمار ، کھانے پینے کا اہتمام ، ووٹروں کو لانے اور لے جانے کے لئے سواری کا انتظام ، لیکن مولانا مرحوم کی ہر دلعزیزی کہ ووٹر ووٹ ڈالنے کے لئے بے چین ، الیکشن میں آپ کی شاندار کامیابی نے پورے علاقے کو حیرت زدہ ہی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی نے جادو کر دیا ۔ اس ضمن میں ادارہ کے ساتھیوں اور مقامی مومنین ومومنات کے ساتھ اصغر حسین صاحب امروہوی عرف جرمن مرحوم کی خدمات بڑی نمایاں تھیں ۔ بنیادی جمہوریت کے نظام کے تحت جب صوبائی اسمبلی کے الیکشن ہوئے تو مولانا کا ووٹ کاسٹنگ ووٹ ثابت ہوا۔ جس کے طفیل مبین الحق صدیقی ممبر منتخب ہوئے اور مغربی پاکستان اسمبلی کے اسپیکر بھی ، مگر واہ رے مولانا عنایت حسین مرحوم کہ جب اکثر بی ڈی کے ممبران بھیڑبکریوں کی طرح بک رہے تھے یہ مرد قلندر کسی کی کچی کوڑی کا بھی روادار نہ ہوا۔ مرکزی اسمبلی کے لئے علامہ سید ابن حسن جارچوی مرحوم کے الیکشن میں بھی ہم نے دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات مولانا مرحوم ، سید علی اظہر جعفری صاحب مرحوم ، امان اللہ بیگ مرحوم سیکریٹری جامعہ امامیہ ٹرسٹ ، سید اشتیاق حسین مدیر الامیر اور دیگر سبھی ساتھیوں نے کوششیں کیں مگر جب اپنے اکثر بی ڈی کے ممبران جن کی کامیابیوں میں ہمارا بھی دخل تھا بک گئے تو دوسروں سے کیا شکوہ ۔ ایک غیر پیشہ ور خطیب اور تحریک پاکستان کی بھاری

بھرکم شخصیت دولت کا مقابلہ نہ کر سکی اور ایسی رسم پڑی کہ جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

حسینی اسکول ناظم آباد

مولانا مرحوم کا اپنا ایک انداز تھا کہ جب کسی کی حمایت کرتے تو خلوص کے ساتھ اور اس کے لئے اپنی تمامتر توانائیاں بھی صرف کرتے ، حسینی اسکول جس کا قیام آل نجم العلماء مولانا سید محمد رضی صاحب مجتہد کی کاوشوں کا مرحون منت تھا۔ جب اس کی انتظامیہ میں اختلافات نے شدت اختیار کرلی اور نوبت مقدمہ بازی اور ہنگامہ آرائی تک پہنچی تو موصوف نے بانی اسکول کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس موقع پر مظہر عباس زیدی مرحوم اور علامہ سید عباس حیدر عابدی مرحوم بھی ہمارے ہم نوا رہے اور یہ ادارہ شکست وریخت سے محفوظ رہا لیکن بعد میں قومیا لیا گیا۔ گذشتہ سال علامہ عباس حیدر عابدی صاحب مرحوم کے تعلقات اور کوششوں سے یقینی حد تک واپسی کی امید ہوگئی تھی لیکن اب یہ ادارہ شاید ہی قوم کی تحویل میں آسکے۔

آل پاکستان شیعہ مطالبات کمیٹی

خطیب اعظم مولانا سید محمد دہلوی مرحوم کے ایما پر رضویہ ہاؤسنگ سوسائٹی کے میدان میں شیعان پاکستان کا ایک نمائندہ کنونشن ۵ ، ۶ ، ۷ جنوری ۱۹۶۴ء کو منعقد ہوا۔ جس میں سرحد ، پنجاب ، سندھ ، بلوچستان اور بنگال سے تین سو سے زیادہ جلیل القدر علماء اور زعمائے ملت نے شرکت فرمائی اور تحریک مطالبات نے جنم لیا۔ اس کنونشن کے انعقاد میں یوں تو لاتعداد افراد نے قابل قدر خدمات انجام دیں لیکن مولانا سید عنایت حسین جلالوی صاحب مرحوم ، مولانا ملک ہندی حسن علوی صاحب مرحوم ، مولانا

شبیہ الحسن صاحب مرحوم ، مولانا سید ابن حسن نجفی صاحب مجتہد ، مظہر عباس زیدی صاحب مرحوم ، مشتاق حسین صاحب نقوی ، نواب حسین صاحب لکھنوی مرحوم اور وحید الحسن رضوی صاحب پیش پیش رہے۔ مولانا مرحوم نے نہ صرف یہ کہ اس کنونشن کے اسٹیج سکریٹری کے فرائض انجام دیئے بلکہ ارباب حل وعقد کی سبجیکٹ کمیٹی میں نمایاں کردار ادا کیا اور تجاویز مرتب کیں۔ شیعہ مطالبات کمیٹی کی تشکیل ہوئی ۔ خطیب اعظم مولانا سید محمد دہلوی صاحب مرحوم اس کے سربراہ مقرر ہوئے اور " قائد ملت جعفریہ " کہلائے۔ اس کمیٹی نے دیگر معاملات کے علاوہ درج ذیل تین مطالبات پر توجہ مرکوز کی ۔

(۱) شیعہ طالب علموں کے لئے جداگانہ نصاب دینیات (۲) شیعہ اوقاف کے لیئے جداگانہ اوقاف بورڈ (۳) تحفظ عزاداری

شیعہ مطالبات کمیٹی کی تنظیم کے لئے قائد ملت جعفریہ نے ملک گیر دورے کئے جن میں اکثر مولانا عنایت حسین جلالوی مرحوم اور مظہر عباس زیدی مرحوم ان کے ہمراہ ہوتے ۔ کراچی میں مولانا مرحوم نے اس جماعت کی تنظیم کی ۔ شیعہ مطالبات کمیٹی کراچی کے نواب افتخار حسین خاں مرحوم اور سید احمد جوہر دہلوی صدر ، مولانا عنایت حسین جلالوی مرحوم نائب صدر اور مظہر عباس زیدی مرحوم سکریٹری منتخب ہوتے رہے۔

۲۸ ، ۲۹ ، ۳۰ اگست ۱۹۶۴ء کو راولپنڈی میں مطالبات کمیٹی کا ایک عوامی کنونشن منعقد ہوا جس میں ملک کے گوشہ گوشہ سے شیعہ نمائندہ اور قرب وجوار کے تقریباً تیس ہزار مومنین شریک ہوئے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۶۴ء کو صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خاں سے مطالبات کمیٹی کے وفد نے ملاقات کرکے شیعہ مطالبات پیش کئے۔ چونکہ ۱۹۶۴ء میں ملک کے تمام شہروں اور شیعہ آبادی کے قصبوں میں مطالبات کمیٹی کی شاخیں قائم ہوچکی تھیں لہذا!

افراد ملت کو اس جماعت کی کارکردگی اور قومی مسائل سے آگاہ رکھنے کے لئے مولانا مرحوم اور مولانا محمد علی درانی مرحوم کی زیر نگرانی ایک خبرنامہ شائع ہوتا رہا۔ ۲۷ ، ۲۸ اگست ۱۹۶۶ء کو آل پاکستان شیعہ مطالبات کنونشن ملتان میں عزت مآب پرنس عباس مرزا صاحب نبیرہ ، واجد علی شاہ ، تاجدار اودھ منعقد ہوا اس اجلاس میں بھی مولانا عنایت حسین جلالوی نے مطالبات کے حق میں تقریر کرتے ہوئے صدر مملکت اور گونر مغربی پاکستان نواب کالا باغ کو متنبہ کیا کہ شیعہ مطالبات سے بے اعتنائی اچھی ثابت نہ ہوگی ۔

۳ اور ۴ جون ۱۹۶۷ء کو لاہور میں مطالبات کمیٹی کا ایک عظیم نمائندہ اجلاس ہوا جس کے آغاز میں ایک وفد نے گورنر سے ملاقات کی اور شیعہ مطالبات پر سیر حاصل گفتگو ہوئی اور جب مطالبات کمیٹی کی تمام تر کوششیں صدر اور گورنر سے ملاقاتیں اور عرضداشتیں بے اثر ثابت ہوئیں تو خطیب اعظم نے ۲ ، ۳ نومبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی میں احتجاجی جلسہ عام کا اعلان کیا۔ حکومتی کارندوں اور قوم کی کالی بھیڑوں اور حکومت کے کاسہ لیسوں نے جس میں پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔ اس احتجاج کو ناکام بنانے کے لئے یہ افواہ عام کی کہ اس اجتماع پر بے دریغ گولیاں چلائی جائیں گی لیکن اس کے باوجود پورے ملک کے نمائندہ اور قرب وجوار کے تقریباً دس ہزار مومنین جمع ہوگئے اور طے ہوا کہ خواہ کچھ بھی ہو بہتر (۷۲) کفن پوش مجاہدین کے دستہ کی قیادت میں جلوس قصر صدارت کا گھیراؤ کریگا۔ اس کفن پوش دستہ میں بھی مولانا مرحوم شریک تھے اگرچہ گھر کے بھیدی اپنا منفی کردار ادا کررہے تھے مگر حکومت کو سراغ رساں ادارے کے ذریعہ حیدریوں کے تیور کا اندازہ ہوگیا اور قبل اس کے کہ جلوس برآمد ہو ، صدر مملکت نے مطالبات کی منظوری کا اعلان کر دیا یہ بات دوسری ہے کہ اس اعلان پر آج تک صحیح معنوں میں عمل نہ ہوسکا البتہ میٹرک کی حد تک دینیات کی کتاب

میں شیعہ دینیات کا حصہ الگ کردیا گیا۔ لیکن آج تک شیعہ اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا نہ امتحانی کاپیاں شیعہ اساتذہ کے پاس گئیں ۔ نتیجہ میں یہ مضمون عصبیت کا شکار ہوگیا۔

مولانا عنایت حسین جلالوی نے کراچی کی ماتمی انجمنوں کی " مرکزی شیعہ فیڈریشن " کی سرپرستی بھی کی اور بوتراب جامع مسجد وامام بارگاہ ٹرسٹ عزیزآباد کراچی کے سربراہ بھی رہے ان دونوں اداروں میں بھی آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مرحوم آخر وقت تک جامعۂ امامیہ ٹرسٹ (جس کے زیر انتظام دینی درسگاہ سے لاتعداد علماء فارغ التحصیل ہوکر مذہبی خدمات انجام دے رہے ہیں) اور مجلس ملی کی سربراہی کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

مجلس ملی پاکستان

ملت جعفریہ کے کل پاکستان اداروں اور مقامی انجمنوں میں تقریباً ربع صدی مسلسل کام کرنے اور ان کی شکست وریخت کے مشاہدہ پر ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ آخر اس توڑ پھوڑ کی خاص وجہ کیا ہے جب کہ مذہبی اداروں کے اراکین کی اکثریت مخلص افراد پر مشتمل ہوتی ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ علمی وفکری نہج پر کام کرنے کا فقدان ہے اور اس طرف کم ہی حضرات متوجہ ہیں جب کہ اس کی ضرورت ، اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ اغیار یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ شیعوں کا مکتب خطابت ہے نہ کہ علمی ، حالانکہ متقدمین میں شیعوں میں بڑے جید علماء ہو گذرے ہیں لیکن ان کے گرانقدر علمی خزینہ عربی اور فارسی میں ہیں جن سے اردو داں طبقہ نابلد ہے۔ مثلاً برصغیر میں شیعت کے فروغ کے خلاف شاہ عبدالعزیز صاحب کی کتاب تحفہ اثنا عشری کا جواب فردوس مآب سید حامد حسینؒ نے عبقات الانوار تحریر کرکے دیا۔ تحفہ اثنا عشری اردو میں ترجمہ ہو کر لاکھوں کی تعداد

میں چھپی اور اس سے کہیں زیادہ اس کے چرچے چھپ کر شیعت کے خلاف جذبات ابھار رہے ہیں لیکن عبقات کا آج تک اردو میں ترجمہ نہ ہوسکا اور اس طرح یک طرفہ کارگزاری جاری ہے۔

ہم نے سوچا کہ تحریری کام اور فکر انگیز تقاریر کی طرف توجہ دی جائے اور علمی فضا پیدا کرنے کے لئے ایک ایسے ادارہ کی تشکیل کی جائے جس میں عہدیداریوں کا جھمیلا نہ ہو بلکہ مخلصین اپنی اپنی صلاحتیوں کے مطابق کام کرتے رہیں۔ صرف ایک سربراہ ہو اور تجاویز پر رائے زنی میں اختلاف رائے ذاتی انا کا مسئلہ نہ بن سکے۔چونکہ ایک عرصہ سے مولانا مرحوم کا مثالی کردار پیش نظر تھا لہذا آپ کو سربراہ بنا لیا گیا اور گذشتہ بیس سال کے دورانیہ میں صدہا میٹنگوں اور جلسوں میں کبھی کبھی اختلاف رائے تو ہوا لیکن الجھن پیدا نہ ہوسکی اور تمام ساتھی ایک دوسرے سے مربوط رہے۔ مولانا مرحوم نے " مجلس ملی " کے انعقاد کی روئیداد کارروائی کے رجسٹر میں اس طرح تحریر کی۔

" ایک عرصہ سے حساس دلوں میں یہ جذبہ پرورش پا رہا تھا کہ ملت جعفریہ میں ایک ایسی تنظیم ہونی چاہیئے جو عام روش سے ہٹ کر کوئی ایسا لائحہ عمل مرتب کرے جو علمی ، فکری ، اخلاقی ، مذہبی اور اقتصادی بنیادوں پر استوار ہو اور ایسی راہیں ڈھونڈے جو دین اور دنیا دونوں کی فلاح کا باعث بن سکے۔

اس سلسلہ میں ایک ذہنی خلش نے ضرور پریشان کیا کہ شیعوں میں انجمنوں کی بہتات اور کثرت ہے نیز ہر قسم کی جماعتیں اور ادارے موجود ہیں پھر کسی نئی تنظیم کی کیا ضرورت ؟ کیوں نہ کسی ، اچھی جماعت ہی میں شریک ہو کر کام کو آگے بڑھایا جائے۔ اس مقصد کے لئے جب غور کیا تو مختلف قسم کی جماعتیں تو نظر آئیں مگر کوئی صرف مذہبی امور کی حد تک ،

کوئی مذہب سے زیادہ سیاست میں دخیل وشریک ، کہیں دوچار جلسے ذاتی انا کی تسکین کے لئے ہوگئے اور بس اور کوئی جماعت ایسی کہ کاغذی پروگرام تو ہے مگر برسوں سے بے عملی کا شکار ، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ جماعت بنے تو ایسی کہ اس میں دین اور دنیا کا امتزاج اس خوبصورتی سے ہو کہ وقتی اور عارضی نہ ہو بلکہ ایک ایسی کشش پائی جائے جو اس کی طویل زندگی کی ضمانت بن سکے اور قول سے زیادہ عمل پر زور دیا جائے۔ نیز دین اور مذہب کی وہ حقیقتیں جو زبانوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں وہ ہماری علمی زندگی میں شامل ہوسکیں تاکہ ہم گفتار کے نہیں بلکہ کردار کے غازی بن سکیں۔ سوچا گیا کہ یہ کام کون کریگا اور کیسے کریگا کیونکہ کردار کی تعمیر کوئی کھیل تماشہ نہیں یہ تو لوہے کے چنے چبانے والا کام ہے اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ جماعت بنانے سے پہلے کچھ ایسے افراد اور باشعور لوگ ڈھونڈ لئے جائیں جو اس عظیم بوجھ کو اپنے کاندھوں پر اٹھانے کیلے آمادہ اور تیار ہوں ۔ اس عظیم مقصد کے لئے سب سے پہلا اجتماع خاتون جنت حضرت فاطمہ الزہرا کی ولادت باسعادت کی تاریخ ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۹۴ ھ مطابق جون ۱۹۷۴ء کو حقیر کے غریب خانہ ۸ ۔ ۳۲۱ عزیز آباد ۴ بجے شام منعقد ہوا جس میں ذیل کے حضرات نے شرکت فرمائی ۔

سید محمود الحسن صاحب رضوی ، ڈاکٹر سید ندیم الحسن صاحب نقوی امروہوی ، پروفیسر غلام عباس صاحب ، سید قمر رضوی ، سید علی حماد صاحب زیدی ، توحید احمد صاحب جعفری ، علی امام صاحب ، سید حسن جعفر صاحب ، مولانا سید کاظم صاحب نقوی ، سید کاظم حسین صاحب امروہوی ، حسن مہدی صاحب وغیرہ

اور طے پایا کہ فی الحال ہر پندرہ دن کے بعد اتوار کو میٹنگ منعقد کی جائے اور کسی مذہبی عنوان پر ہر فرد تقریر کرے تاکہ ہر شریک مجلس کو

مافی الضمیر ادا کرنے کا ملکہ اور قوت پیدا ہوسکے۔ چنانچہ پہلے ہی اجتماع میں مختلف حضرات نے جناب سیدۃ النساء العالمین کی سیرت پر اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار فرمایا اس کے بعد دو اجتماعات مزید غریب خانہ ہی پر منعقد ہوئے اور ان میں کافی حضرات شریک ہوئے اور تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ بات طے پائی کہ اس جماعت کا کوئی نام ضرور ہونا چاہیئے۔ چنانچہ متعدد ناموں میں سے ایک نام استخارہ کے بعد منتخب کیا گیا" مجلس ملی "

ملت جعفریہ کی پاکستان میں پچیس سالہ کوششوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک کتابچہ " غور تو فرمایئے کہ ہم کہاں ہیں " کے نام سے شائع کیا گیا اس کے بعد پابندی کے ساتھ ہرپندرہویں روز اجتماعات منعقد ہوتے رہے اور مختلف مقامات پر یہ سلسلہ جاری رہا۔ مثلاً کھوکھراپار کالونی میں مولانا وزیر علی صاحب کے یہاں اور دوسرا حسن جعفر صاحب کے یہاں منعقد ہوا۔ نارتھ ناظم آباد میں ڈاکٹر ندیم الحسن صاحب کے یہاں باوقار اجلاس ہوا۔ امام بارگاہ جعفریہ گولیمار ، امام بارگاہ شاہ نجف مارٹن روڈ، مسجد تنظیم المومنین عزیز آباد بوتراب امام بارگاہ عزیزآباد ۔ جامعہ امامیہ ناظم آباد میں کئی اجلاس ہوئے پروفیسر زین العابدین صاحب کے دانشکدہ پر لیاقت آباد میں کافی حضرات نے شرکت کی حسینی مشن ڈرگ روڈ پر بھی اجتماع ہوا۔ نئی کراچی اور ملیر کے اجلاس بھی کامیاب رہے۔

جب یہ بات نظر آئی کہ اب لوگ اس جماعت کی ضرورت محسوس فرمانے لگے ہیں اور تقریباً ایک سال تک دور دراز کے مقامات پر اجتماعات میں شرکت کرتے رہے ہیں تو " مجلس ملی " کے مخلصین کے لئے پنج نکاتی ملی پروگرام تجویز کیا گیا۔

جماعت کا نصب العین پاکستان میں ملت جعفریہ کی عزت و عظمت کے ساتھ ایسے کارکن اور افراد پیدا کرنا ہیں جو نام و نمود کی خواہش سے بالاتر

مذہب کیلئے ایثار اور قربانی کرنے والے اور آڑے وقت میں ملت کے کام آنے والے ہوں ۔ اور جب تک مخلصین کی ایسی جماعت نہ بن جائے کسی بڑے کام کا آغاز بے سود ہوگا فی الحال مجلس ملی تقریر کرنے کی تربیت بھی کرے گی اور تالیف وتصنیف کا پروگرام بھی بنائے گی اور لوگوں بالخصوص تعلیم یافتہ حضرات کو ان کے ملی فرائض سے روشناس کرائیگی اور ان میں ملی خدمت کا جذبہ ابھارنے کی پوری کوشش کریگی ۔"

یہ مولانا مرحوم کی پرکشش شخصیت ، نیک نیتی اور ساتھیوں کے حلقہ تعارف پر اعتماد تھا کہ اس قافلہ میں ملت جعفریہ کراچی کے نمائندہ افراد شریک رہے۔ ذیل میں ان حضرات کے اسماء گرامی درج ہیں جو " مجلس ملی " کی پندرہ روزہ اور ماہانہ نشستوں میں شریک ہوتے رہے۔ گوکہ یہ فہرست بہت تشنہ ہے اصل فہرست بہت طویل ہے جو بخوف طوالت بہت سے اسمائے گرامی سے محروم رکھی جا رہی ہے۔

جناب رئیس امروہوی ، جناب سید محمد تقی امروہوی ، ڈاکٹر علی سرور (سابق صدر شعبہ معاشیات) ، پروفیسر شباب حیدر نقوی ، مولانا سخن فتح پوری (مرحوم) ، علی مظہر رضوی سابق ڈائریکٹر انفارمیشن (مرحوم) ، نواب افتخار حسین خاں مرحوم ، پروفیسر علی عسکری زیدی ، علی بندہ سید زوار حیدر ، سید ببر حسن رضوی ، سید رشید حیدر رضوی ، علامہ عباس حیدر عابدی ، ڈاکٹر ندیم الحسن نقوی امروہوی (شہید قلم) ، سید کاظم حسین امروہوی ، پروفیسر سید سبط جعفر زیدی ، آل محمد رزمی ، سید مرتضیٰ زیدی ، امیر اعظم ایڈوکیٹ ، یوسف بھائی نذر علی ، مولانا سید محمد نجفی ، سید اشتیاق حسین ، عظمت بلگرامی ، قربان حسین عابدی (مرحوم) مولانا کاظم حسین نقوی (مرحوم) ، مولانا محمد جعفر وسیم (مرحوم) ، ڈاکٹر سید خاقان حسن ، ہمایوں ادیب ، مرزا وزیر حسن بیگ ، سید حیدر علی جعفری ، سید محمد رضا رضوی ، سید احمد میاں

زیدی راہی جہانگیر آبادی ، پروفیسر سید مسعود الحسن زیدی ، پروفیسر سید زین العابدین ، مولانا وزیر علی (مرحوم) ، سید حسن عباس زیدی (مرحوم) پروفیسر رضا شاہ نقوی ، مولانا سید جواد الاصغر نقوی ، نثار احمد قلندری ، ڈاکٹر سید ہلال نقوی امروہوی ، پروفیسر فرحت مظفر جعفری (مرحوم) ، محمد بُو علی نقوی (مرحوم) ، میر عابد حسین مرحوم ، ڈاکٹر ہاشم علی کاظمی ، پروفیسر سید آل حیدر (ڈین فیکلٹی آف ایجوکیشن ، جامعہ کراچی) ، ریٹائرڈ کرنل سید ناصر حسین رضوی ، سید مظہر امام ایڈوکیٹ ، سید علی اظہر جعفری ، پروفیسر محمد مقصود ، سید مظاہر حسین عابدی ، مولانا رضی الدین حیدر (بانی یادگار حسینی اسکول الہ آباد) ، ڈاکٹر محمد عظیم (مرحوم) وغیرہ

مجلس ملی کے روح پرور اجتماعات

یہ مختصر سا کاروان میانہ روی سے چلتا رہا اور مزید صاحبان علم ودانش اس میں شریک ہوتے رہے۔ ہر ماہ دو نشستیں مخلصین کے دولتکدوں اور جامعہ امامیہ میں منعقد ہوتی رہیں جن میں مختلف عنوانات پر تقاریر ہوئیں اور مقالات پڑھے گئے مثلاً کلام پاک کی تدوین اور تحریف کا الزام ، ملت مسلمہ کے زوال کے اسباب ، اسلامی نظریہ عبادت ، نہج البلاغہ کی ادبی عظمت تنظیم ملی کا طریقہ کار ، معراج ختمی مرتبتؐ ، عظمت انسانی ، روزہ کی فضیلت ، اجتہاد وتقلید کی اہمیت ، عدل الہیٰ ، پندرھویں صدی میں ملت جعفریہ کی ذمہ داریاں ، برصغیر پاک وہند میں ملت جعفریہ کا ماضی اور مستقبل ، فقہ جعفریہ کی عظمت ، قرآن مجید کا اعجاز وغیرہ ۔

ان نشستوں میں عام طور سے مخلصین مجلس ملی ہی خطاب کرتے اور مقالہ پڑھتے لیکن " نہج البلاغہ کی ادبی عظمت " پر مولانا منتخب الحق جیسے جید عالم اور کراچی یونیورسٹی کے اسلامک آئیڈیالوجی کے پروفیسر نے یادگار تقریریں فرمائیں ۔ اس طرح " شیعت ہندوستان میں " کے عنوان پر عالمی

شہرت یافتہ مورخ سید اطہر عباس رضوی صاحب مرحوم نے جن کی لاتعداد کتابیں اور مقالے مغربی دنیا میں تشنگان علم کی پیاس بجھا رہے ہیں عالمانہ تقریر کی۔

ان نشستوں کے علاوہ مجلس ملی نے اپنے قلمکاروں کے اعزاز میں اور اس دنیا سے رخصت ہوجانے والوں کے لئے بڑے پیمانے پر تعزیتی اجلاس منعقد کئے۔ ہمارے سالانہ جلسوں کا عنوان اور مرکز فرزند رسول الثقلینؐ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ذات گرامی رہی۔ ان سالانہ جلسوں جن کی صدارت سید اسرار حسین ایڈوکیٹ مرحوم، فضیلت مآب جسٹس فخرالدین جی ابراہیم سابق گورنر سندھ، ڈاکٹر احسان رشید صاحب سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی، پروفیسر کرار حسین صاحب سابق وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی وغیرہ کرتے رہے۔

مجلس ملی کے زیراہتمام ادیب اعظم مولانا سید ظفر حسن صاحب مرحوم کی تفسیر القرآن کی پہلی جلد کی اشاعت کے سلسلے میں ایک جلسہ تبریک وتہنیت ۱۴، اگست ۱۹۷۷ء کو صبح ۱۰ بجے امام بارگاہ شاہ نجف مارٹن روڈ میں پروفیسر کرار حسین صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوا اور اسی طرح جب یہ تفسیر مکمل ہوئی اور آخری جلد شائع ہوئی تو ایک جلسہ جامعہ امامیہ میں ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی مرحوم پروفیسر کینبرا یونیورسٹی آسٹریلیا کی زیر صدارت منعقد ہوا۔

مجلس ملی کی سالانہ کارکردگی مولانا مرحوم خود بیان کرتے اور دیگر حضرات مثلاً دفاعی مبصر کرنل غفار مہدی صاحب، معروف فلسفی سید محمد تقی صاحب، جعفر بھائی نذر علی، احمد جعفر صاحب، صغیر حسین جعفری صاحب ایڈوکیٹ، مولانا مشتاق حسین شاہدی صاحب، پروفیسر علی رضا شاہ صاحب نقوی قومی مسائل پر اظہار خیال فرماتے رہے۔

مولانا مرحوم کی سربراہی میں مجلس ملی نے مذہبی علوم سے عدم دلچسپی اور باقاعدہ درس حاصل کرنے والوں کے فقدان کے پیش نظر جامعہ امامیہ میں شام کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ کورس تین ماہ کا تھا جس میں ادیب اعظم اپنی پیرانہ سالی کے باوجود درس دیتے اور مولانا عنایت حسین جلالوی باقاعدہ خدمات انجام دیتے رہے۔۔ پندرہ روزہ ارشاد نے مجلس ملی کی خدمات پر ایک خاص نمبر یکم مئی ۱۹۷۹ء کو شائع کیا۔

فروری اور مارچ ۱۹۷۹ء میں تین جلسے بڑے اہمیت کے حامل تھے۔ آقائے خمینیؒ کی اسلامی تحریک کو سمجھنے کے لئے ایک اہم اجلاس جامعہ امامیہ میں منعقد ہوا۔ دوسرا فقہ جعفریہ کی عظمت کے عنوان پر شاہ نجف مارٹن روڈ میں عظیم جلسہ منعقد ہوا جس میں مفتی جعفر حسین مرحوم طاب ثراہ ، نے فقہ جعفریہ کی خصوصیات اور عظمت پیش کی جسے بہت پسند کیا گیا اور تیسرا اجلاس امام بارگاہ مارٹن روڈ پر ہی منعقد ہوا جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی ۔ عنوان تقریر تھا ۔ اجتہاد اور تقلید ۔ اس پر ڈاکٹر ندیم الحسن صاحب نقوی مرحوم ، مولانا سید عنایت حسین جلالوی مرحوم ، علامہ طالب جوہری صاحب نے انتہائی اہم اور بصیرت افروز تقریریں کیں ۔

پیشہ وارانہ مشورے

قوم کے نوجوان بغیر سوچے سمجھے میٹرک اور انٹر میں مضامین کا انتخاب کرلیتے ہیں اور ان میں کامیابی کے بعد مناسب مواقع نہ ملنے کے باعث پریشان ہوتے ہیں۔ انتخاب مضامین اور پیشہ ورانہ مشوروں کے لئے مولانا مرحوم ، راقم الحروف اور پروفیسر ایس ایم جعفر صدر شعبہ معاشیات کراچی یونیورسٹی مسلسل شام کے اوقات میں جامعہ امامیہ میں حاضری دیتے رہے لیکن نونہالان قوم نے اس ضمن میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی ۔ لہذا یہ سلسلہ ختم کردینا پڑا۔

اتحاد ملی کی کوشش

ملت جعفریہ کراچی میں افراتفری اور اتحاد عمل کے فقدان سے نہ صرف یہ کہ اغیار فائدہ اٹھاتے رہے بلکہ حکومت بھی اس پھوٹ کو اپنے مفاد میں استعمال کرتی رہی اور شیعان حیدر کرار دوسرے درجے کے شہریوں کی سی حیثیت اختیار کرنے لگے۔ اس صورت حال پر اکثر بزرگوں ، دانشوروں ، اور علماء سے گفتگو ہوئی ۔ عام رائے یہی تھی کہ ملی اتحاد کے لئے علماء وخطباء کے اتحاد کو اولیت حاصل ہے۔ لہذا طے کیا گیا کہ غیر متنازعہ مقام پر سب کو جمع کیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر ندیم الحسن نقوی کے دولتکدہ پر علامہ طالب جوہری مدظلہ ، علامہ سید رضی جعفر صاحب مدظلہ ، علامہ سید عباس حیدر عابدی صاحب مرحوم ، پروفیسر سید علی رضا شاہ صاحب نقوی مدظلہ ، علامہ عباس کمیلی صاحب مدظلہ جمع ہوئے ۔ بلاتکلف گفتگو ہوئی گلے شکوے ہوئے حالات پر تبصرہ ہوا اور آئندہ کے لیئے مولانا مرحوم نے اس سلسلے میں افراد ملت ، خطیبوں اور ذاکرین کے لئے ایک لائحہ عمل تیار کیا جس پر تمام علماء کرام اور ذاکرین عظام نے دستخط کیئے اسے شائع کیا گیا اور اس پر عمل کی حتی الوسع کوشش کی گئی ۔ ان تمام پروگراموں میں ایک غیر ذاکر خاکسار بھی شریک ہوتا رہا۔

شیعوں کا قتل عام اور شعائر مذہبی کی بے حرمتی

مولانا مرحوم بڑے ہی رقیق القلب اور ہمدرد انسان تھے۔ ۸۴ ۔ ۱۹۸۳ ء میں جب شیعوں پر بے تحاشہ مظالم ڈھائے گئے ، امام بارگاہوں اور مساجد کو نذر آتش کیا گیا ، قرآن کے جلے ہوئے صفحے گلیوں میں پھک رہے تھے تو یہ سب آپ پر بے حد شاق گذرا ۔ اس سے پہلے ٹھیری کے سانحہ میں متاثر ہونے والوں اور اسی دور میں علی بستی گولیمار میں شہید ہونے والوں کی

تجہیز و تکفین اور تباہ و برباد ہونے والوں کی امداد اور داد رسی میں آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

نفاذ شریعت

نفاذ شریعت کے نام پر جب ایک مخصوص طبقہ نے اپنے مکتب فکر کی بالادستی کے لئے شریعت بل پیش کیا تو ہم نے مجلس ملی کی جانب سے اردو میں ایک یادداشت تیار کی جسے نہ صرف ارباب حل وعقد اور اراکین قومی اسمبلی اور سینٹ کو روانہ کیا بلکہ ہزاروں کی تعداد میں عامتہ المسلمین میں تقسیم کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ یہ بل نظریہ پاکستان کے خلاف ، دستور پاکستان سے متصادم اور شیعوں کے لئے ناقابل قبول ہے جو افتراق بین المسلمین کا سبب بنے گا۔

بے خوف شخصیت

مولانا مرحوم جانتے ہی نہ تھے کہ خوف کہتے کس کو ہیں ، وہ ایک نہایت ہی دلیر اور نڈر انسان تھے۔ اکثر خطرناک مواقع پر موصوف نے جس بے خوفی کا مظاہرہ کیا وہ مثالی تھا۔ مثلاً جب ہمارے بزرگ اس پر رضا مند ہوگئے کہ مرکزی جلوس عزاء نشتر پارک سے پریڈی اسٹریٹ صدر کی بجائے سیدھا بند روڈ سے گذر جائیگا۔ لیکن مجمع قدیمی راستہ پر مڑا تو حکام ضلع نے روکا۔ شرکاء جلوس نے مداخلت کی ۔ لاٹھی چارج اور شیلنگ ہوئی ۔ مجمع چھٹ گیا تبرکات کے پاس معدودے چند افراد باقی رہے۔ مولانا مرحوم بھی بے خوف وخطر اس مختصر سے مجمع میں موجود رہے اور جلوس پرانے راستہ سے گذرا ۔ اس طرح جب پہلی مرتبہ قصر مسیب رضویہ ہاوسنگ سوسائٹی سے برآمد ہونے والے ۸ ربیع الاول کے جلوس پر پتھراؤ ہوا تو عام مجمع ادھر ادھر ہوگیا لیکن مولانا عنایت حسین مرحوم اپنی جگہ جمے رہے۔ نیز جب ۲۱ مارچ

۱۹۸۳ء میں امام بارگاہ جعفریہ گولیمار ناصبیوں کے نرغے میں آگئی اور راقم الحروف کے والد مکرم سید منظور الحسن بلا جھجک ان کے مجمع میں چلے گئے تو سپاہ یزید کے شمر صفت ایک ملعون نے ۸۳ برس کے سن رسیدہ بزرگ کو خنجر مارا۔ زین العابدین اسپتال لائے گئے۔ سرجن تاجدار حیدر صاحب نے آپریشن کیا لیکن جانبر نہ ہوسکے ۔ اس ہنگامہ خیز دور میں جب شہداء کی میتیں پولیس اپنی تحویل میں دفن کرا رہی تھی لیکن خاکسار کی حکام بالا سے ردوقدح کے بعد کمشنر صاحب نے حسب منشاء تدفین کی اجازت دیدی لیکن اس کے باوجود غلط فہمیوں اور وسوسوں کا شکار احباب اور عام مومنین کا مجمع رضویہ سوسائٹی سے چھٹنے لگا لیکن مولانا مرحوم نہ صرف یہ کہ مسلسل ساتھ رہے بلکہ میت کے ساتھ ایمبولینس میں روانہ ہوئے۔ اعزاء کے علاوہ صرف وحید الحسن رضوی صاحب ، عشرت صالح صاحب ، علی غضنفر صاحب سابق کونسلر ، حسن عباس زیدی صاحب اور مظہر تقی رضوی صاحب ساتھ جاسکے ۔ البتہ کھارادر اور جنت البیقع کے قبرستان میں کثیر مجمع ہوگیا جس میں پروفیسر علی رضا شاہ اور علامہ عباس کمیلی صاحب دیگر احباب اور قومی کارکن بھی شریک ہوئے۔ علاوہ ازیں ۸۴ - ۱۹۸۳ء کے پرخطر حالات اور کشیدہ ماحول میں جب لوگ ایک مدت تک گولیمار جاتے ہوئے جھجکتے تھے ۔ مولانا مرحوم بے خوف وخطر وہاں مجلسیں پڑھنے جاتے رہے اور کبھی کوئی جھجک نہ محسوس کی ، یہ قدرت کا نظام ہے کہ شیعہ شہداء کے خون ناحق کو چھپانے کے لئے تمام شہر ہی نے نہیں خود حکومت نے بھی ایسے دستانے پہنے کہ اس کے بعد کراچی خون میں نہاتا رہا اور ہزاروں قتل ہوئے لیکن لہو آلود ہاتھ تلاش نہ کیئے جاسکے نہ کوئی گرفتار ہوا نہ کسی کو سزا ملی ہے ۔ نتیجہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

ایک معلم، ادیب اور مبلغ

مولانا زیادہ تر درس وتدریس کے پیشہ سے وابستہ رہے ۔ حسینی ہائی اسکول میں اردو ادب اور دینیات کی تعلیم دی اور پریمئیر کالج میں اسلامک اسٹڈیز کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ اکثر کراچی یونیورسٹی اور جناح پوسٹ گریجویٹ کالج میں بھی اپنے مضمون کا درس دیا۔ جیسا کہ آپ کے شاگردوں سے معلوم ہوا موصوف کا طریق تدریس اور طرز تعلیم بھی ایسا ہی دلکش اور پرتاثیر تھا جیسی کہ آپ کی شخصیت ۔ جتنا زیادہ ادق مضمون ہوتا اس کو اتنی ہی محنت اور دلچسپی سے سمجھاتے تاوقتیکہ مفہوم ذہن نشین نہ ہوجاتا۔ موصوف اردو ادب سے گہرا لگاؤ اور سچی وابستگی کے ساتھ تحقیقی اور تنقیدی مزاج رکھتے تھے۔ مشاعروں اور مرثیہ کی مجلسوں اور منقبتوں کی محفلوں میں پابندی سے شریک ہوتے۔ ماہنامہ " ساحل " کے مدیر بھی رہے۔ اکثر اخبارات اور مجلوں میں آپ کے مضامین بھی شائع ہوتے۔ جعفر بھائی نذر علی کے یہاں ولادت باسعادت امام حسین علیہ السلام کے سلسلہ کی سالانہ محفل قصیدہ خوانی جو بعد نماز مغربین شروع ہو کر دوسرے دن گیارہ بجے ختم ہوتی رہی آپ باوجود بیماری کے اس کی صدارت فرماتے رہے۔ موصوف الفاظ روزمرہ محاورے ، خیال ، اسلوب اور قوائد وانشاء کے محاسن پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ شاعر کی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر کسی رودرعایت اور لاگ لپیٹ کے وہی بات کہی جسے وہ جائز سمجھتے تھے۔

محمدؐ وآلؐ محمدؐ سے محبت آپ کی گھٹی میں پڑی تھی اور خدمت مذہب حقہ آپ کی عادت ثانیہ ۔ آپ نے تبلیغ مذہب کو کبھی ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ مرحوم نے صدہا مجالس عزا سے خطاب کیا لیکن نذرانہ لینا تو درکنار

اپنے خرچ سے گئے اور آئے۔ میری معلومات میں موصوف تو نکاح خوانی کا نذرانہ بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ مجالس عزاء ، میلادالنبیؐ ، یوم حسینؑ کے جلسوں اور آئمہ معصومینؑ کی شہادت اور ولادت کی مجلسوں اور محفلوں میں بلاعذر وتکلیف تشریف لے جاتے اور ایسے نکات بیان کرتے کہ مجمع عش عش کرنے لگتا۔ مصائب بیان کرتے وقت آپ پر بلا کی رقت طاری ہوتی خود روتے اور مجمع کو رلاتے۔ عشرہ محرم کے سلسلہ میں اندرون وبیرون ملک سفر کیئے ۔ کراچی کے علاوہ پشاور ، اسلام آباد ، کوئٹہ ، بدین ، تلہار ، میرپورخاص ، نوابشاہ ، خیرپور ، صادق آباد ، گلگت ، نیزجدہ ، امریکہ اور افریقہ کے مختلف شہروں میں عشرہ مجالس سے خطاب کیا۔ آپ جامعہ امامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے اس قدیم ادارہ کی بہتری اور برتری کیلئے ہمہ وقت مصروف رہے۔

مولانا مرحوم اب ہم میں نہیں لیکن مشرقی تہذیب و وضعداری اور حسن معاشرت کا نمونہ ، قدیم روایات کا گنجینہ ، پاک وپاکیزہ بے داغ یو پی کے روایتی اشرافیہ لباس میں ملبوس ایک نرم رفتار اور نرم گفتار شخصیت نظروں کے سامنے ہے۔ خصوصاً انکے ڈرائنگ روم میں آویزاں انکی مسکراتی تصویر دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب بولنے والے ہیں۔ ملت جعفریہ میں ہر دور میں ایسی ہستیاں پیدا ہوتی رہی ہیں جنہوں نے ملت کو بیدار کرکے اس میں روح عمل پھونکنے میں اپنی عمریں صرف کردیں۔ اس دور کی ان عظیم ہستیوں میں ایک ذات مولانا سید عنایت حسین جلالوی اعلی اللہ مقامہ کی بھی تھی ۔ جس کے پہلو میں ایک حساس دل تھا جس میں قوم کا درد بھرا تھا۔ آپ ہمیشہ قوم کو کچھ کرنے آگے بڑھنے اور باعزت رہنے کی تلقین کرتے ۔ موصوف اتحاد بین المسلمین کے داعی تھے لیکن ادغام کے قائل نہ تھے۔

محمدؐ وآلِ محمدؐ کے عاشق ۔ ان کی تقدار کے مبلغ اور ہمارے لئے نمونہ عمل بروز ہفتہ بتاریخ ۸ ، اکوبر ۱۹۹۴. ڈیڑھ بجے شب قابل تقلید حیات کے ذریں نقوش چھوڑ کر اس جہان فانی سے انتقال کرگئے۔ مجھے تقریباً ۲ بجے شب اطلاع ملی ۔ مرحوم کے دولتکدہ پر حاضر ہوا۔ احباب کو اس جانکاہ واقعہ کی اطلاعات بہم کیں ۔ مرحوم کی نماز جنازہ بوتراب مسجد وامام بارگاہ میں بعد نماز ظہر آل باقر العلوم حجت الاسلام مولانا سید ابن حسن مجتہد کربلائی مدظلہ العالیٰ کی اقتدا میں ادا کی گئی میت سوگوار اعزاء ، احباب اور عقیدتمندوں کے جم غفیر میں عزیز آباد کے قبرستان لے جائی گئی ۔ حجت الاسلام مولانا سید رضی جعفر نقوی مدظلہ نے تلقین پڑھائی سویم کی مجلس میں سوز خوانی سید ابرار حسین صاحب نے سلام آل محمد رزمی اور پروفیسر سبط جعفر صاحب نے پڑھا اور حجت الاسلام مولانا سید رضی جعفر نقوی نے خطاب فرمایا۔

مولانا خوش نصیب تھے کہ آپ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کرگئے پسماندگان میں بیگم صاحبہ کے علاوہ تینوں بیٹیاں شادی شدہ ہیں اور خوش وخرم ۔ بڑے صاحبزادے مصدق صاحب بھی شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں ان کے علاوہ دو صاحبزادے حسن سلمہ اور سلمان سلمہ ہیں ۔ سب سے بڑی صاحبزادی اور سب سے چھوٹے صاحبزادے مذہبی خدمات میں مشغول ہیں۔ دونوں مجلسیں پڑھتے ہیں اور اس طرح مولانا کی نسل میں علم وفضل کا سلسلہ جاری ہے اور کربلا سے جو پیغام پہنچا ہے وہ سید ہمدانی کی نسل کے ذریعہ عام ہوتا رہیگا۔

مجلس ملی

کا

پنج نکاتی عملی پروگرام

مجلس ملی کا ہر مخلص :- ----------

۱۔ نماز پنجگانہ کی پابندی کرے گا۔

۲۔ ہر روز کم از کم آدھا گھنٹہ کسی دینی یا اچھی کتاب کا مطالعہ ضرور کریگا۔

۳۔ ذاتی کردار کی تعمیر کا پورا پورا خیال رکھے گا۔

۴۔ ماہ بماہ ذاتی آمدنی سے اپنے لئے کچھ ضرور بچائے گا۔

۵۔ سوتے وقت اپنا محاسبہ کرے گا کہ اس نے آج اپنے دین و ملت کے لئے کیا کام کیا۔ اگر نہیں تو کیوں ؟

مجلس ملی کے افکار واحساسات

مجلس ملی ایک ایسی تحریک جس کے مخلصین ملت جعفریہ کا ماضی ، حال اور مستقبل ، احساس وشعور کی کسوٹی اور عقل وفکر کے پیمانوں پر تولنا اور پرکھنا چاہتے ہیں اور صرف جذبات کی رو میں بہہ کر یا احمقوں کی جنت میں رہ کر ہمچو من دیگر نیست کا نعرہ لگانا ہرگز ہرگز پسند نہیں کرتے۔

مجلس ملی ایک ایسی تحریک جس کے مخلصین قوموں کے عروج وزوال کی داستانوں سے واقف اور ان کی تباہی کے رازوں سے آشنا ہیں اور اب ملت جعفریہ کی ابتری اور انتشار سے بے چین ہو کر تابناک مستقبل بنانے کے متمنی اور خواہش مند ہیں ۔

مجلس ملی عمل اور کردار کی عظمت کو مہتم بالشان جانتی ہے اور فرد کی تہذیب وتطہیر کے بعد اجتماعی تنظیم کے پروگرام پر عمل پیرا ہے اور سب سے پہلے اپنے حلقہ بگوشوں کی اصلاح ضروری تصور کرتی ہے۔

مجلس ملی دنیا کو یہ بتانا چاہتی ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے اور خاتم النبینؐ اور انکے اہلبیت اطہارؑ نے اسلام اور انسانیت کی عظمت کے لئے صرف قربانیاں اور ایثار ہی نہیں کیا بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں لازوال اور انمٹ نقوش چھوڑے ہیں جو آج سارے زمانے کے لئے رشد وہدایت کا سرچشمہ ہیں۔

مجلس ملی اس امر پر یقین رکھتی ہے کہ ملت کے درخشاں مستقبل کا انحصار اس کے نوجوانوں کی صحیح تعلیم وتربیت، ان کے حقیقی نظم وضبط اور ان کے افکار علوم اور صلاحیتوں کو صحیح سمت میں مصروف کار رکھنے ہی میں مضمر اور منحصر ہے۔

مجلس ملی یہ بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ دور ماضی پر فخر کرنے یا پدرم سلطان بود کہنے کا نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ اور ہر علم وفن میں مقابلہ اور سخت مقابلہ کا ہے۔ وہی جماعت کامیاب وکامران ہے جس کے افراد اس چیلنج کو قبول کرکے محنت کو شعار اور عمل کو جزو زندگی بنانے کے لئے آمادہ اور تیار ہیں۔

مجلس ملی علماء اور ادباء کے لئے تحقیق کا مرکز، مولفین ومصنفین کے شاہکاروں کی اشاعت کا ذریعہ، نوخیز نوجوانوں کے لئے تحریر وتقریر کی تربیت گاہ اور اکابرین ملت اور معززین قوم کے افکار وخیالات سے مستفید ہونے کا مفید ترین پلیٹ فارم ہوگا۔

مجلس ملی کا میدان عمل صرف مذہبی اور اخلاقی ہی نہیں بلکہ اس کا دائرہ کار تعلیمی، اقتصادی اور ہر وہ شعبہ حیات ہے جو ملت جعفریہ کو اپنے ملک میں

عزت و عظمت کی زندگی سے ہم کنار اور دین ودنیا دونوں میں سربلنداور سرخرو کرسکے۔

مجلس ملی ملکی سیاست کو شجر ممنوعہ تو تصور نہیں کرتی لیکن اس امر پر یقین رکھتی ہے کہ اس پُرخار وادی میں سرگرداں رہنے کے بعد ملت کے اہم امور اور ضروری کام صحیح طور پر انجام نہیں دیے جاسکتے۔ لہذا مجلس ملی اپنے لئے سیاست سے دور رہنا ہی مفید تصور کرتی ہے۔

مجلس ملی کوئی وقتی یا عارضی ادارہ نہیں بلکہ پاکستان میں ملت جعفریہ کی تقریباً تیس سالہ کوششوں میں ناہمواری ، ربط کے فقدان اور ناکامیوں کے پس منظر میں طویل المیعاد پروگرام پر عمل اور منصوبہ بندی کے ساتھ کام کرنے کے لئے جماعتی تشکیل کا اہتمام ہے۔

مجلس ملی کسی فرد یا جماعت کی حریف نہیں بلکہ ملت کی ہر شخصیت اور ہر ادارے کو عظیم جانتی ہے اور تمام جماعتوں اور افراد میں عمل کی بنیاد پر ہم آہنگی اور منتشر وسائل کو مربوط کرکے ملی مصائب کو دور کرنے کی متمنی ہے۔

مجلس ملی کے مخلصین خود پسند اور خود سر نہیں بلکہ ہر قدم پر علماء اور زعماء ملت کے مشوروں اور تعاون کے محتاج ہیں اور ہر موقع اور ہر محل پر مفکرین اور دانشوروں کی رہنمائی کے خواہش مند ہیں " **تعاونوا علی البرو التقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان** "

مجلس ملی میں شامل ہونے کے لئے ذاتی انا کو دفن ، نام ونمود کی خواہش سے بے نیاز اور ذاتی مفاد پر ملی مفاد کو ترجیح دینے کا عزم تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ مذہبی امور نجی زندگی میں داخل کئے جاتے ہیں اور ملک وملت کے لئے قربانی پیش کرنے کے جذبہ سے سرشاری ضروری ہے۔

مجلس ملی کا نصب العین ادغام اور انضمام نہیں بلکہ اتحاد واتفاق بین

المسلمین ہے اور جیو جینے دو اس کی پالیسی اور اس کا نعرہ سید الشہداءؑ کا یہ ارشاد ہے:

"ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر"

مجلسِ ملی پاکستان کا نصاب

مخلصین مجلس ملی کے مطالعہ کے لئے پروفیسر مولانا سید عنایت حسین جلالویؒ کی تجویز کردہ کتب

۱۔ ولایت فقیہ ۔ آقائے خمینیؒ

۲۔ ہماری اقتصادیات ۔

۳۔ اصل اصول شیعہ ۔

۴۔ لاتفسدوافی الارض ۔ امامیہ مشن لاہور

۵۔ خلافت وحکومت ۔ امامیہ مشن لاہور

۶۔ اسلام کا حکیمانہ نظام زندگی ۔

۷۔ جواہر البیان ۔ علامہ نوری طبرسی

۸۔ نورالعصر ۔ مولانا سید محمد دہلوی

۹۔ حکومت الہیہ وسیاست علویہ ۔ مولانا ظفر حسن صاحب

۱۰۔ سوانح عمریاں آئمہ اثنا عشر ۔ نظامی پریس

۱۱۔ عقائد الشیعہ ۔ مولانا ظفر حسن صاحب

۱۲۔ اسلام کا نظام زندگی ۔

۱۳۔ حکومت ربانی ۔ ڈاکٹر فاروقی

۱۴۔ شہید اعظمؒ ۔ ڈاکٹر فاروقی

۱۵۔ فتح مبین ۔

۱۶۔ جمہوریت اور اسلام ۔ ۱۷۔ درس قرآن مجید

ایک نثار ایک انشاء پرداز

تحریر: عباس شہیر

ہمارے عہد کو مردہ پرست عہد کہا جاتا ہے ۔ جو زندہ فرد کو زندہ درگور اور زیرِ پناہِ لحد کو ایک ازسرِنو حیاتِ تازہ بخشتا ہے ۔ یہ ایک عمُومی تاثر ہے مگر ہمارے خیال میں اب معاشرہ اس صفت سے بھی محروم ہوگیا ہے (اگر اسے صفت ہی سمجھ لیاجائے تو) بلکہ اب مردہ کو ذرا گہرا دفن کر دینا ضروری سمجھا جاتا ہے مَبادا اس کی شخصیت کا کوئی رخ اس طرح روشن نہ ہوجائے کہ سرِزمین جو لوگ موجود ہیں انہیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔ سو اب مردہ پرستی بھی آہستہ آہستہ اپنی منزل آخر کی طرف گامزن ہے۔

اس مضمون یا تحریر کا شمار نہ تو مردہ پرستی میں ہوتا ہے اور نہ مرحوم پروفیسر عنایت حسین جلالوی صاحب کی ذاتی شخصی کردار سے قوم کو آگاہی بخشنے کی نیت کیوں کہ ذاتی کردار اگر عہدِ حیات میں ہی تسلیم کر لیا گیا ہو تو بعد از حیات ایسی کوئی کوشش کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی مگر ایک ایسا رخ جو انسان کی شخصیت کا مرہون منت تو ہوتا ہے مگر اس کی ملکیت نہیں ہوتا اور وہ رخ ہے تعمیری افکار، قولاً یا تحریراً ۔ یہ رخ امانت ہوتا ہے ان افراد کا جن کے لئے لکھا جائے جن کے لئے بولا جائے۔ بولتی زبان تو بالاخر رک جاتی ہے اور بولے جانے والے تمام الفاظ تحلیل ہوجاتے ہیں کون کتنا اثر قبول کرے یہ سامع کی حساسیت پر ہے بہرطور آواز کو مثل انسان فنا ہے۔ یہ انسان کی تحریر ہے جو اس کی فکر کی درحقیقت قرطاس پر مجسم تصویر ہے ۔ فرد درحقیقت کیا سوچتا ہے کیا چاہتا ہے اور تخیلات کی اپج کیا ہے اس کی تحریر ان سب سوالات کا واضح جواب فراہم کرتی ہے۔

تحریر اس کی امانت ہوتی ہے جس کے لئے لکھا جائے ۔ سو اس نظریہ کے تحت پوری امتِ وسطیٰ عمومی طور پر اور ملّتِ جعفریہ خصوصی طور پر

پروفیسر عنایت حسین جلالوی مرحوم کی تحریر کا حقِ ملکیت رکھتی ہے کیوں کہ ان کے حرف حرف کا مخاطب افرادِ ملت ہیں بلکہ حروف تو حروف اعرابِ الفاظ بھی درد و غم قوم میں پور پور ڈوبے ہوئے ہیں آپ کو انشاء اللہ یہ تحریریں بغرض مطالعہ حاصل ہوں گی تو اس دعوے کے اول تائید کنندہ خود آپ ہوں گے ۔ سو میں صرف اتنا کر رہا ہوں کہ حقدار کو اس کا حق پہنچا کر جو کہ پوری ملت ہے اس ملت کے ساتھ عدل کرنے کا مرتکب ہو رہا ہوں کیوں کہ حقدار کو حق دینا ہر مہذب معاشرے میں بہترین عدل ہے۔

پروفیسر صاحب حیرت انگیز طور پر اپنی پوری زندگی میں بحیثیت نثر نگار کے سامنے نہیں آئے بلکہ ایک خطیب کی حیثیت سے پہچانے گئے ہو سکتا ہے کہ بہت سے حضرات بلکہ شائد ان کے قریبی احباب بھی پروفیسر صاحب کو بحیثیت نثر نگار کسی تبصرے کا موضوع و مرکز بنتا ہوا دیکھ کر حیرت کا اظہار کریں اسی سبب سے غالباً ان کے کسی بھی ارادت مند یا ہم نشیں نے اپنے تحریری تاثرات میں ان کی شخصیت کے اس روشن مگر بظاہر غیر نمایاں رخ کا ذکر یا حوالہ نہیں دیا ۔ ان کے طرز تحریر پر کسی بھی تبصرے سے پہلے ہم اس بات کو واضح کر دیں کہ آخر وہ کیا وجوہات تھیں جو اس صاحبِ طرز انشاء پرداز کے ایک نامور و باقاعدہ ادیب بننے میں مانع رہیں ۔

ہندوستان کی تقسیم نے صرف علاقائی جغرافیہ ہی کو تبدیل نہیں کیا بلکہ صدیوں سے قائم تہذیبی اقدار کی تباہی اور اشراف کی معاشی صورتحال کی ابتری کی ذمہ دار بھی بنی ۔ سرحدوں کے آر پار انتقالِ آبادی نے معاشرتی منظر نامے کو یکلخت تبدیل کر دیا۔ اب وہ ہی منظر تھا جو خواجہ حسن نظامی نے غدر کے حالات پر اپنی تحریروں میں دکھایا ہے یعنی کل کے اشراف آج کے مصیبت زدگان اور کل کے رذیل آج کے شرفاء قرار پائے ماضی کے معاشی آسودگان آج جرعہ جرعہ آب کو اور لقمہ لقمہ روٹی کو حاصل کرنے کی

انتہائی مشقت میں گرفتار ہوگئے سوئے قسمت یہ ہی وہ طبقہ تھا جو اس برصغیر میں فطری صلاحیتوں سے مالا مال اور صاحب فکر وفن تھا۔ علوم وبصیرت کا مالک اور وارث مجاہدہ سلف تھا۔ مگر درپیش صورتحال نے اس کو معاشی جدوجہد کے دشت لوط میں ایسالاڈالا کہ فطری صلاحیتیں خاک ہوگئیں بصیرت ختم اور بصارت صحرائی سراب کے دھوکے میں گرفتار ہوکر رہ گئی۔

ان پر آشوب حالات میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو اس طبقہ کو جس کے وہ خود بھی رکن تھے گرداب سے نکالنے کے لئے میدان عمل میں نکل آئے انہوں نے اپنی فنی صلاحیتوں کو اجتماعی فوائد کی طرف گامزن کردیا ایک طرف وہ اپنی معاشی جدوجہد کو جاری رکھے ہوئے تھے تو دوسری طرف ملی بہتری کے لئے سرگرم عمل تھے ایسی دو طرفہ جنگ میں اگر کسی سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ اپنی تمام فطری صلاحیتوں کو کماحقہ، کمال تک پہنچا دے گا تو شاید یہ اس فرد کے ساتھ بہت زیادتی ہوگی پھر وہ لوگ جو اپنی ہر صلاحیت کو محض اس مقصد کے لئے وقف کر بیٹھے ہوں کہ صرف ان کے حالات بہتر نہ ہوں بلکہ ملت بحیثیت مجموعی اس بھنور سے نکل آئے تو ایسے لوگ اپنی چند صلاحیتوں کو معراج پر پہنچانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنی ہر صلاحیت کو بقدرِ ضرورت استعمال کرتے ہیں تاکہ ان کا مقصد عظیم پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ پروفیسر عنایت حسین جلالوی دراصل ایک ایسا ہی نام ہے جو مندرجہ بالا بیانات کا ممدوحِ حقیقی ہے یہ ممکن نہیں ہے کہ انہیں اپنی صلاحیت تحریر کا اندازہ نہ ہو کیونکہ ان کے ہم مکتب اور نامور عالم دین مولانا محسن مجتہد صاحب نے فرمایا ہے کہ "دور طالب علمی سے ہی لوگ ان کے پاس مختلف مضامین پر لکھوانے کے لیئے آتے تھے اور وہ مجالس بھی لکھ کر دیا کرتے تھے ان میں تحریری صلاحیتیں بہت تھیں"۔ عنایت حسین صاحب کی نثری صلاحیت پر صرف یہ بیان ہی سند ہے۔

پروفیسر عنایت حسین صاحب اپنی ہمہ جہت مصروفیات کے باوصف نثر نگاری پر کامل تو کیا جزوی طور پر بھی توجہ نہ دے پائے لہذا کوئی کتاب بھی منظرِ عام پر نہ آ پائی، کشائش روزگار اور ملت کا غم انہیں اس طرف آنے ہی نہ دے سکا مگر یہ بھی ناممکن ہے کہ خدا کسی اہل کو صلاحیت دے اور اس کی تابانی سے خلق خدا ہی محروم رہ جائے سو بعد از وفاتِ حسرت آیات جب ان کے تحریر کردہ مقالات اور مختلف موضوعات پر گرانقدر مضامین جمع کیئے گئے تو ظاہر ہوا کہ گو بحیثیت نثار وہ پہچانے تو نہ گئے مگر مختلف علمی نشستوں اور یادگاری سیمینارز میں جو مقالات و مضامین پیش کئے وہ اردو ادب اور قومی تشخص کا بہترین اثاثہ ہیں سو میں ایک مرتبہ پھر اپنی یہ بات دہراؤں گا کہ میں بحیثیت نثار عنایت حسین صاحب کی تحریروں کے محاسن پر تبصرہ کرنے کی جسارت محض اس لئے کر رہا ہوں کہ ان کے علمی اور قومی بحر میں ڈوبے ہوئے طرز تحریر کو اس ملت پر اجاگر کر سکوں جو اگر محسوس کرے تو ان کے لفظ لفظ کا مخاطب ہے۔

ایک لاابدی اصول ہے کہ صاحب قلم کی ہر تخلیق کو جانچنے کا پیمانہ اس کے خیالات کی بلندی اور اثر آفرینی ہے ۔ یعنی خیالات جو قلمبند کیئے گئے ہیں وہ کس سطح فکر سے تعلق رکھتے ہیں ۔

پست خیالات کبھی شستہ و شائیستہ زبان میں تحریر نہیں کئے جاسکتے مگر یہ ضمنی مسئلہ ہے اگر بہترین زبان میں تحریر کر بھی دیئے جائیں تو بھی وہ تحریر ادب میں کوئی حیثیت نہیں رکھے گی لہذا جتنا بلند خیال ہوگا تحریر کی اہمیت بھی اسی لحاظ سے ہوگی ۔ بلند خیالی کے لیئے اولین شرط بہترین مطالعہ ہے ثانیاً مثبت مشاہدہ ثالثاً مثبت سوچ ۔

پروفیسر صاحب کے مقالات کو خصوصیت سے دو اقسام میں الگ الگ شناخت کیا جاسکتا ہے ۔ اولاً وہ مقالات و مضامین جو تحقیقی نوعیت کے

ہیں مثلاً " تعلیم کی تاریخی روایت " ، " خدا کون ؟ تاریخ خدا پرستی کے تناظر میں " ، " فقہ اور مکاتب فقہ کا تقابلی جائزہ " وغیرہ اور دو تم وہ مقالات و مضامین جو خصوصیت سے علمی موضوعات سے بحث کرتے ہیں ، مثلاً شریعت محمدیؐ میں اجتہاد کی اہمیت ، موت ، حدیث وغیرہ ۔ تیسرا پہلو بھی ہے جس پر اس وقت ہم عمداً روشنی نہیں ڈال رہے ہیں کیونکہ وہ آگے بحث میں بہت تفصیل کے ساتھ سامنے آئے گا اور وہ رخ ہے قومی وملی رنگ کا اسے ہم فنی محاسن کے ضمن میں نہیں بیان کریں گے بلکہ یہ پروفیسر صاحب کا دلی جذبہ اور مقصد روحانی تھا اس جذبے کے پرتو نے ان کی تحریر کو کیا رنگ دیا ہم اس حوالے سے اس تیسرے پہلو کا جائزہ لیں گے۔

ایک عالم اور باعمل عالم کی تحریر کا رنگ خالصتاً علمی ہی ہوسکتا ہے تمام دستیاب تحریری مواد میں ایک عمومی عنصر جو شدت کے ساتھ نمایاں ہے وہ علمیّت کا ہے ۔ اسکی ایک وجہ موضوعات کا چناؤ بھی ہوسکتا ہے جو مُتقضائے حکیمانہ طرز تحریر رہا ۔ مگر ایسے بھی مضامین نظر آتے ہیں جو عمومی معاشرتی مسائل سے علاقہ رکھتے ہیں گو ان میں نسبتاً سہل اسلوب نظر آتا ہے مگر عالمانہ شان پوری طرح جلوہ گر ہے ۔ کتاب Life after (مصنفہ Death حفاظت حسین چغتائی صاحب) پر " موت " کے عنوان سے تبصرہ کرتے ہوئے ایک بہت عام سے پہلو کو عِلمی انداز سے اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

" یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آج دنیا میں ہر اصلاحی قانون ناکام نظر آتا ہے جتنے قوانین بنائے جاتے ہیں اور اصلاح کے پروگرام پیش کیئے جاتے ہیں اس سے زیادہ جرائم میں اضافہ ہوجاتا ہے اور یہ وہ مسئلہ ہے جس نے دنیا بھر کے عقلمندوں اور مفکّروں کو مضطرب کر رکھا ہے اور ان کی تدابیر اور کوششیں ناکام نظر آتی ہیں ۔ اگر ہم قیامت کے عقیدے پر ایمان

لے آئیں تو واحد ذریعہ ہے کہ ہماری اصلاح ہو سکتی ہے اور انسانیت فلاح پا سکتی ہے۔"

تحریر کی علمی شان کے حوالے سے ایک مزید اقتباس کے بعد ہم اپنے بنیادی نکات کے بیان پر واپس لوٹ جائیں گے کیونکہ یہ اقتباسات محض ابتدائی تعارف کی حیثیت رکھتے ہیں وگرنہ آپ تمام محاسن پر تبصرے کے حوالے سے جتنے بھی اقتباسات ملاحظہ فرمائیں گے وہ سب ایک جیسی ساحرانہ عِلمیّت کے نمونے محسوس ہوں گے مندرجہ ذیل اقتباس آپ کے مضمون " پندرھویں صدی ہجری میں ملت جعفریہ کی ذمہ داریاں " سے لیا گیا ہے تجزیاتی اسلوب اور حکیمانہ لہجہ کا بہترین نمونہ ہے۔

" ایک اور بات زمانہ بدل گیا، بدل رہا ہے اور بدلتا رہے گا اور تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہو رہی ہیں ۔ لوگوں کا یہ خیال کہ ہمیں بھی بدل جانا چاہیئے ورنہ سکوت اور جمود موت ہے ۔ کسی حد تک درست ہو سکتا ہے مگر تغیرات تو دوامی ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں آج کچھ ہے کل کچھ جو کیفیات موجودہ وقت میں ہیں کیا کل بھی یہی ہوں گی ؟ لہذا زمانہ کے ساتھ ہم کب تک بدلتے رہیں گے ۔ دوسرے یقیناً ہمیں حرکت کرنا چاہیئے اور ضرور کرنا چاہیئے مگر یہ حرکت اس وقت درست اور مناسب معلوم ہوگی جب کہ ہم منزل کا تعین کرلیں اور صحیح سمت طے پا جائے ورنہ مخالف سمت میں گاڑی چل پڑی تو واپس ہونا کیا اپنے بس میں اور ممکن ہوگا ؟ "

پروفیسر صاحب کے مقاصد بلند تھے نگاہ دوربیں اور بصیرت دروں بیں تھی انہیں اپنی قوم اس حالت میں ملی کہ بحیثیت قوم وہ ناکارگی کا شکار تھی صدیوں سے آباد شدہ بستیوں کو چھوڑ کر نئے وطن بسانے کو ابھی تک اس نے ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا ماضی کی عظمتیں نئے وطن میں حال کی تہمتیں بن گئیں ، تو اس کے عقل و شعور نے مستقبل کی فکر ہی ختم کر دی

اس نئے وطن میں پہلے سے موجود افراد ملت بھی اپنے ہندو ساھوکار، جاگیردار اور انگریز سرکار کی غلامی سے تازہ رہائی کے بعد جامے سے باہر تھے سو وہ بھی ترقی معکوس کا عملی نمونہ بن چکے تھے ایسے میں قوم کو ایسے افراد کی ضرورت تھی جو اس ملت کے بخت کو اسی طرح بیدار کردیں جس طرح جنگ آزادی کے بعد سر سید نے کیا تھا ہر چند حالات معروضاً یکساں نہ تھے مگر مزاجاً ایک ہی تھے یعنی اب بھی پہلے کی طرح بیداری ملت کا کام کرنا تھا آگے کون آئے ؟ وہ جو خود بھی لٹے پٹے قافلے کا مجروح مسافر ہے یا وہ جو ہر طرح سے آسودہ حال ہے ، مگر اب بھی مجروح مسافروں میں سے کچھ کو آگے آنا پڑا ، بہر مسیحائی ، سو انہوں نے اپنی آواز کو اپنے قدموں کو اپنے اعضاء و جوارح کو اور اپنے قلم کو سربسر ملت کے لئے وقف کردیا۔

عنایت حسین ایسا ہی رہبر تھا جس نے اپنی آواز وقلم اور اپنی تمام ممکنہ انسانی صلاحیتوں کو صرف ملت کرنے کا فیصلہ کیا یہ فیصلہ ایک عظیم مقصد سے وابستگی کا فیصلہ تھا ان کی پوری زندگی ذات کو اجتماع کے وسیع تر مفاد میں ضم کردینے کے بلند عزائم کا شاہکار بن گئی سو ان کی تحریریں جو درحقیقت کثرت سے ان مضامین پر مشتمل ہیں جو عموماً کسی ملی امور پر منعقد مجلس و سیمینار میں پڑھے گئے یا پھر مختلف علمی تنظیموں کے زیر اہتمام ہونے والے اجلاسوں یا نشستوں میں پڑھے گئے ان ہی بلند عزائم کے بلند خیالات ہیں ۔

ان کی تحریروں کا پس منظر واضح ہونے کے بعد اب اگر تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو ان کی تحریریں فرد اور ملت دونوں کو عالی حوصلہ بناتی ہوئی نظر آتی ہیں ان کی تحریروں کا رنگ وہ ہی ہے جو سر سید نے اپنے مضامین میں مسلم امت کو جگانے انہیں حوصلہ مند بنانے اور ماضی سے حال و مستقبل تک لانے کے لئے اختیار کیا میں ان کا موازنہ شخصی کردار کے اعتبار سے سر

سید سے نہیں کرسکتا کیونکہ سرسید کا شخصی و ذاتی کردار ہمیشہ متنازع ہی رہا۔ کسی طویل بحث سے بچنے کے لئے میں صرف اتنا کہوں گا کہ پروفیسر عنایت حسین کا کردار ذاتی حیثیت سے بھی متنازع نہ رہا مگر ملی کردار وہ ہی نظر آتا ہے جو سرسید کا اپنے عہد میں تھا فرق صرف ہے تو کاوشوں کے ثمر بار ہونے کا۔ ہم نے پہلے بھی یہ نکتہ اٹھایا تھا کہ بلند خیالی کے ساتھ مثبت مشاہدہ لازم ہے تا کہ نثرنگار صرف بلند خیال ہی پیش کرکے نہ رہ جائے بلکہ قارئین کو مثبت اور قابل عمل منصوبہ بھی دے سکے۔ "پندرھویں صدی ہجری میں ملت جعفریہ کی ذمہ داریاں" میں لکھتے ہیں۔

"ملت کی عظمت کے اور ترقی کے چار عناصر ضروری ہوتے ہیں (۱) مذہبی اور دینی عظمت (۲) اقتصادی خوشحالی (۳) علمی اور تعلیمی برتری (۴) اخلاق اور کردار کی تعمیر"

گویا پورا لائحہ عمل طے ہوگیا۔ خواتین کے کردار کو قومی ترقی کے تناظر میں اسی مضمون میں طے کیا ہے کہ ہماری خواتین جو نصف آبادی ہیں اب تک قابل ذکر اور نمایاں طور پر میدان عمل میں نہیں آئیں لہذا ان کی شان کے مطابق ذمہ داریاں سونپ کر انہیں متحرک کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ طبقہ جو اب تک اپنی توانائی کو استعمال نہ کرپایا ہو اگر اسے موقع دیا جائے تو وہ بہت بہتر طور پر حالات کا سامنا کرتا ہے۔

انہوں نے اپنی ذات سے بلند ہو کر پوری قوم پر نظر رکھی۔

عقل خودبیں دگرو عقل جہاں بیں دگراست

اپنے مقالے "تعلیم کی تاریخی روایت" میں لکھتے ہیں۔

"اور جب کوئی قوم ان اجتماعی تصورات کے شعور سے بے بہرہ ہوجائے جو اسے عمل اور قربانی پر ابھارتے ہیں تو تاریخ پر اس کی گرفت

ڈھیلی پڑجاتی ہے۔۔۔۔۔۔ وہ تاریخ عالم میں کوئی بڑا کارنامہ تو کیا انجام دے گی خود اپنے وجود تک کو برقرار نہیں رکھ سکتی تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ جب کسی قوم نے اپنی منزل کا شعور چھوڑ دیا تو وہ نقش پا کی طرح مٹا دی گئی ۔"

یہ قوم کو اس کے زوال کے اسباب سے آگاہی بخشی گئی ہے مگر ایک عامل مُصلح کی حیثیت سے انہوں نے قلم کو یہاں روک نہیں دیا بلکہ مثبت مشاہدہ وسوچ کا ثبوت دیتے ہوئے اس زوال سے بچنے اور نکلنے کی تدبیر بھی موزوں کی ہے اسی مضمون میں لکھتے ہیں ۔

" تعلیم صرف تدریس کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ایک قوم خود آگاہی حاصل کرتی ہے اور عمل اس قوم کے تشکیل دینے والے افراد کے احساس وشعور کو نکھارنے کا ذریعہ ہوتا ہے اور اس کا مقصد ایسے بلند انسان پیدا کرنا ہے جو اپنے کردار و سیرت کے اعتبار سے ممتاز مقام رکھتے ہوں ۔"

خیال اگر تحریر کا بنیادی اور اصل نکتہ ہوتا ہے تو اسلوب تحریر اسکا گوشت پوست ہوتا ہے ۔ خیال کی بلندی اور ارفع مقاصد کا اظہار اپنی اثر آفرینی کے لئے موزوں اور قابل فہم زبان چاہتے ہیں ۔ اعلیٰ تصورات اگر روکھی پھیکی زبان میں بیان کر دیئے جائیں یا پیرائیہ بیان غیر دلچسپ ہو تو تحریر کبھی بھی اپنا مقصد حاصل نہیں کرپاتی لہٰذہ محاسن نثر میں بنیادی حیثیت طرز بیان کو حاصل ہے ۔ دوران مطالعہ ہم نے بھی اور ان تمام احباب عنایت حسین مرحوم نے بھی جو ان کی تحریروں کو خود ان کی زبانی مختلف نشستوں میں سماعت کرچکے ہوں گے یا مطالعہ کرچکے ہوں گے یہ بات لازماً محسوس کی ہوگی (اور ہم نے کی ہے) کہ ان کا طرز تحریر معنیٰ آفرینی اور اثر پذیری کے لحاظ سے انشا پردازی کا عمدہ نمونہ ہے۔ مسئلہ کوئی سا بھی ہو

بہت سہولت کے ساتھ اسے قاری پر واضح کردیتے ہیں موضوع کی موزونیت سے زیادہ انداز بیان سادہ مگر علمی رنگ قاری کی توجہ تحریر کی سمت کامل رکھتا ہے ۔ آخرِالذکر مقالے ہی سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں فلسفہ تعلیم پر بحث کی ہے ۔ گو مسئلہ خالص فلسفہ کا ہے مگر انشاء پردازی کا کمال یہ ہے کہ اوسط ذہن کا قاری بھی اطمینان سے صاحبِ مضمون کی بات کو سمجھ سکتا ہے اس اقتباس کا تعلق تعلیم کے بے عقیدہ ہونے کے نظریئے سے ہے۔

" حقیقت یہ ہے کہ علم اس وقت حقیقی اور درست رہنما کا کام سرانجام دے سکتا ہے جب اس کا محور دل ہو ورنہ صرف تن پرستی کے چکر میں یہ انسان کے لیئے زہر جیسا خطرناک ہوسکتا ہے۔ تعلیم کے بارے میں اس رجحان کا نتیجہ لامرکزیت اور علم کی شعبہ جاتی جزو پرستی کی صورت میں نکلا ہے ۔ بے عقیدہ تعلیم انسان کو ایک ہی محور پر مرتکز کرنے میں ناکام رہی ہے۔"

سلاست آپ کی تحریر کا وصفِ خاص ہے روانی و گنگناتا بہاؤ بحیثیت اقتباس یہاں تحریر کرنا بہت مشکل ہوگا کیونکہ یہ بہت طویل اقتباسات ہوتے ہیں اور پورے پیراگراف میں سے کوئی جزو دینا اس تسلسل پر تازیانہ بن کر لگتا ہے مگر ثبوت دعویٰ کے طور پر ہم ان کے مضمون " عدل " سے ایک مختصر اقتباس نظر قارئین ضرور کرنا چاہیں گے۔

" ہر شئے کی ترتیب و تنظیم ایک دوسرے کا ربط موزونیت اور مناسبت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ہمارا خالق مدبر بھی ہے اور منصف بھی زمین جو سب سے زیادہ پست سمجھی جاتی ہے اور ہر مخلوق جس پر رواں ہے جسکے سینے پر ہل چلا کر اور جگر شگافتہ کرکے کاشت کی جاتی ہے اور جسکی آغوش میں سمندر مُتلاطم ہے اگر اتنی سخت نہ ہوتی تو کون اس کو پامال کرسکتا تھا اور کس طرح شاہراہیں اور فلک بوس عمارتیں تعمیر ہوتیں

تحریر ایک دعویٰ کی حیثیت رکھتی ہے مصنف کے لئے لازمی ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل و براہین سے کام لے یعنی استدلالی طرز کو اختیار کرنا پڑتا ہے ۔ عملی محاذ کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہوتا مگر فکری محاذ پر اصل مسئلہ مخاطب کو اپنے خیالات پہنچانے کے ساتھ ساتھ اس کو اپنے نکتہ نگاہ سے اتفاق پیدا کروانا ہوتا ہے جس کے لئے استدلالی اسلوب سے کام لینا پڑتا ہے اور خصوصیت سے اگر موضوعات فکری شان اور علمی انداز رکھتے ہوں تو یہ امر لازمۂ تحریر بن جاتا ہے ۔ پروفیسر صاحب کی قلمی کاوشیں صرف اور صرف فلاح واصلاحِ قوم کے لئے تھیں ایسی تحریریں جو کسی کو خصوصیت سے بیدار کرنے اور حوصلہ مند بنانے کے لیئے استعمال ہو رہی ہوں ان کا رنگ خصوصیت سے استدلالی فکر کا حامل ہوتا ہے مگر آپ کی تحریر کی شان یہ ہے کہ ان موضوعات پر بھی اسی نوع سے بحث کی ہے جو مذہبی یا اخلاقی شعبہ ہائے زندگی سے متعلق ہیں مثلاً مضمون بعنوان " موت " میں لکھتے ہیں۔

" یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ اندھی فطرت کو تو اس جہان کا خالق مانا جاسکتا ہے مگر ایک عاقل اور مدبر اللہ کو پیدا کرنے والا نہیں مانا جاسکتا ۔

اسی طرح مضمون بعنوان " عدل " کا پورا مضمون استدلالی مزاج کا نمونہ نظر آتا ہے بخوفِ طوالت یہاں ہم بے شمار اقتباسات بغرض ملاحظہ نہیں دے پا رہے ہیں ۔

پروفیسر صاحب کا تعلیمی پس منظر خالصتاً مذہبی ہے مگر ان کی تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ انہوں نے اپنے ہر علمی مقالے کو جدید سائنسی نظریات ، صاحبانِ نظریہ اور روزمرہ کے سائنسی مشاہدات سے بھرپور انداز میں مزیّن کیا ہے۔ مضمون (مقالہ) " خدا کون ؟ تاریخ خدا پرستی کے تناظر میں " ہو یا " عدل " " موت " ہو یا " پندرہویں صدی میں ملتِ جعفریہ کی

ذمہ داریاں " موضوعات کا تنوع صاف نمایاں ہے مگر ان کی سائنسی اپج ہر موضوع کو تازہ تر بنانے اور اذہانِ عامہ کو ترغیب مطالعہ دیتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ " عدل " سے اقتباس دیکھیں ۔

" یا پھر تقریباً تین چوتھائی سمندر اک بے حد ناپیدا کنار تاحد نظر پانی ہی پانی ۔ اگر نمکین نہ ہوتا تو تعفن پیدا نہ ہوجاتا اور اسکا تعفن اس کی عظیم اور لامحدود مخلوق کو زندگی بخش سکتا تھا ؟ کیا لاکھوں قسم کے حشرات اور مخلوق کی یہی نمک اور آب شور غذا نہیں ہے ؟ "

" زمین اگر گول ہونے کے بجائے ہموار رہتی تو ہر طرف پانی ہی پانی ہوتا اور زمین نظر نہ آتی ۔ "

تحریر میں شگفتگی و برجستگی ازحد ضروری ہوتی ہے اور حسن تحریر کے لئے بھی ، تاکہ وہ عام قاری کے لئے قابل قبول ہوسکے ، یہ ایک اہم عنصر ہے ۔ آپ کی تحریریں اس وصف سے مُتصف ہیں ایک ماہر اِنشاء پرداز کی حیثیت سے انہوں نے اپنی تحریر کو دلچسپ پیرائیہ عطا کیا تاکہ دوران مطالعہ دقیق موضوعات ذہن پر بوجھ نہ بن جائیں اور آخر تک دلچسپی برقرار رہے " خدا کون ؟ ۔۔۔۔ " سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو ۔

" سوال یہ تھا کہ اس دنیا کا خالق کون ہے اور جواب دینے چلی ہے سائنس جو محض تجربات و مشاہدات سے بحث کرتی ہے اس کی دسترس اور پہنچ صرف مادیات یا محسوس ہونے والی چیزوں تک ہے ۔ سائنس یہ تو بتا سکتی ہے کہ زمین پر جو مٹی ہے وہ کون کون سے اجزاء اور کون کون سے مادوں سے ملکر بنی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ مگر یہ کیسے بتائے گی کہ اسے کس نے بنا ڈالا ؟

ابتک ہم نے جن محاسنِ نثر پر روشنی ڈالنے کی جسارت کی ہے وہ محض اصل کا جزو ہیں تبصرے کی طوالت کے سبب سے ہم نے بہت سے نکات کو موضوع بحث تو بنایا ہی نہیں بلکہ جن پر گفتگو کی ہے وہ بھی ممکنہ

حد تک مختصر رکھی ہے تاکہ قارئین ایک ہی نشست میں اس تبصرے کا مطالعہ کر سکیں اس سلسلے میں مجبوری کی وجہ سے پروفیسر صاحب کی تحریروں سے جو ناانصافی ہو رہی ہے وہ معذرت کی محتاج تو نہیں ہے مگر اس کی تلافی اس صورت میں کسی حد تک ہوجائے گی جب علمی حلقے پروفیسر صاحب کی نثری حیثیت کو پہچان کر اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں گے اور دوسری طرف اچھی تحریروں کے مشتاق قارئین ان کی قلمی کاوشوں سے مستفید ہوں گے ۔ یہ پہلی کوشش اور پہلا پتھر ہے جو بحیثیت نثر نگار پروفیسر صاحب کی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لئے کی جا رہی ہے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ اس قوم کے ساتھ ظلم ہوتا جس کو آسودہ دیکھنے اور خوشحال بنانے کے لئے آپ نے اپنی تحریر کے حرف حرف کو وقف کر دیا تھا ۔

اب جب پروفیسر صاحب کے مقالات و مضامین عوام الناس اور علمی حلقوں کے دست ذوق تک بہر مطالعہ پہنچ چکے ہیں تو ہر قاری خود ہی مبصر بھی ہے اور خود ہی منصف بھی ۔

مقالات

پروفیسر عنایت حسین جلالوی صاحب کے یہ چند مقالات شائع کئے جارہے ہیں جو آپ نے مجلس ملی کی ماہانہ نشستوں اور دیگر جلسوں میں پڑھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شریعت محمدیؐ میں اجتہاد کی اہمیت

شریعت کی ضرورت کیوں ؟

تجدد کا زور ہے اور حریت فکر کا زمانہ ، کوئی بھی آزاد منش انسان اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ بلاوجہ کسی کا مطیع اور پابند بنا دیا جائے۔ یا کسی کی اطاعت کا کلاوہ اس کی گردن کا ہار ہوجائے اسلئے یہ بات اور سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ شریعت کی پابندی کیوں ؟

اس وقت ہم ان سے مخاطب ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق اور صانع جانتے ہیں اور جو رب الارباب کے وجود کے قائل ہی نہیں ان سے اس عنوان پر بحث ہی بے کار ہوگی ۔ کیونکہ پہلے وجود باری تعالیٰ ثابت کرنا ہوگا پھر کوئی اور بات لہذا یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔

کرہ ارض پر کیا کچھ نہیں ہے۔جمادات بھی ہیں اور نباتات بھی طرح طرح کے حیوانات بھی ہیں اور انسان بھی ۔ لیکن ہر ذی شعور اور بافہم انسان یہ جانتا ہے کہ اس دنیا کی مختلف انواع واقسام کی مخلوقات میں انسان ہی بہتر اور افضل ہے اور جو کمالات اور خوبیاں ، جو قدرت اور طاقت جو عقل و تفکر اس کو حاصل ہے وہ کسی دوسری مخلوق کو نہیں ۔

اور یہی وہ بات ہے جسے اسلام مختلف انداز میں پیش کرتا ہے کہ اس زمین پر رب العالمین کا سب سے پہلا مظہر انسان ہی ہے اسی کو اللہ نے اپنا نائب نامزد کیا۔ اسی کی تخلیق پر اپنا قصیدہ پڑھا۔ اسی کو مسجود ملائکہ بنایا۔ یہی وہ شاہکار قدرت ہے جس نے زمین کی دیگر اشیاء یہ کہہ کر مسخر فرمائیں۔

الم تری ان اللہ سخر لکم مافی الارض

اے انسان کیا تو دیکھتا نہیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو جو

زمین میں ہیں تیرے لئے مطیع بنا دیا۔

(النجم ۹)

اور کبھی فرمایا

لقد کرمنا بنی آدم ..... الخ

ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا کی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق دیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو فضیلت عطا کی۔

(بنی اسرائیل ۷)

انسان کی تخلیق، اس کی تجسیم و تشکیل، اس کا تفکر اور عقل، اس کی صلاحیت واستعداد، اس کا علم و عمل، اسکے جذبات واحساسات، اسکا انداز زندگی، اس کی خلقت کے اسرار ورموز ہر شے پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم کارنامہ اور ایسا عجوبہ ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس نے اپنے اس بہترین شاہکار کو بلاوجہ اور بغیر مقصد کے پیدا کیا۔ یاپیدا کرنے کے بعد اس کی فلاح وبہبود اسکی خوشگوار زندگی کے لئے کوئی طریقے معین نہیں کئے۔ کیا کوئی باشعور فرد اس بات کو پسند کریگا کہ کوئی صانع اپنی بہترین صفت اور انوکھی تخلیق کو قدرت کے باوجود ٹھوکریں کھانے اور زمانہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دے گا، نہ اس کے تحفظ کا اہتمام کرے اور نہ ایسے آئین وضوابط بنائے گا جس سے وہ امن وسکون سے بسر کرسکے؟ نہیں کبھی نہیں بلکہ یقیناً صانع کی کوشش ہوگی یہ میرا شاہکار ہر قسم کے حوادثات سے محفوظ رہے۔ شر کی قوتیں اس کو پست و نابود نہ کرسکیں وہ اپنے مقصد حیات کو اس خوبی سے پورا کرے کہ دنیا دیکھتی رہ جائے اور ایسے آئین وضوابط پر عمل پیرا رہے کہ صحیح معنیٰ میں میرا شاہکار کہلانے کا مستحق ہوسکے۔

یعنی انسان کی فلاح وبہبود کے اصول وقوانین اور اسکو تباہ وبربادی سے محفوظ رکھنے کے طریقوں کا نام شریعت ہے۔ اسی لئے شریعت کے معنی واضح اور روشن رلستے کے ہیں اور اصلاح میں ایسا طریقہ کار جو عوام کی فلاح کیلئے کسی نبی کی طرف سے پیش کیا جائے۔

اسی لئے شریعت ہر انسان کیلئے ضروری ہے۔ جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے۔

لکل جعلنا منکم ..... الخ

تم میں سے ہر ایک کے لئے شریعت اور راہ عمل مقرر کر دی گئی ہے۔ (المائدہ ۲۴)

شریعت انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے اور اسلئے بھی کہ انسان کا خالق انسان کی تمام ضروریات اور احتیاجات سے واقف ہے اسلئے اس نے ہر اچھی اور بری بات کیلئے قانون بنایا اور انسان کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت فرمائی۔

شریعت کی جامع تعریف ان الفاظ میں ملی ہے۔ عقائد کی تقویم، اعمال کی درستگی، اخلاق کی تہذیب، خاندانی زندگی کی بہتری اور ملکی سیاست کی استواری کیلئے اللہ کا وہ قانون جو کسی رسول کے ذریعہ حاصل ہو۔ ظاہر ہے ہر شعبہ حیات شریعت کے سایہ میں آئے گا۔ شریعت اور فقہ میں اس وقت لوگ کوئی فرق پیدا نہیں کرتے لیکن تھوڑا سا فرق ضرور ہے۔ ورنہ جس طرح فقہ حنفی اور فقہ جعفری کی اصطلاحات رائج ہیں شریعت حنفی اور شریعت جعفری کہنا بھی درست ہوتا مگر ایسا نہیں ہے۔

شریعت اصول اور فروع دونوں پر حاوی ہوتی ہے اور فقہ صرف فروعی مسائل سے بحث کرتی ہے۔

بات پھر وہیں آئی کہ شریعت ہر انسان کیلئے کیوں ضروری ہے ؟ جب شریعت کے معنیٰ اور مفہوم راہ عمل کے ہیں تو کون ہوشمند انسان ایسا ہوگا جو زندگی بسر کرنے کے لئے کوئی طریقہ کار معین نہ کرے۔ ہرازم ایک طریقہ کار ہے۔ اور جو کسی اصول کے پابند نہیں ہوتے ان کی بے اصولی ہی ایک ضابطہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اب شریعت اسلامیہ اور عمومی راستوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک اللہ کا معین کردہ راستہ ہے اور دوسرا انسان کا۔ اب یہ انسان کی مرضی ہے کہ وہ اپنے لئے کس راستہ کا تعین کرتا ہے۔

شریعت نے اللہ کے راستہ کے دو واضح سنگ میل معین کئے۔ امربالمعروف اور نہی عن المنکر نیکیوں کو پھیلائے اور برائیوں سے روکے۔ ساری فقہ انہیں دو محوروں کے گرد گھومتی ہے یعنی انسان کے حقیقی نفع اور نقصان پر۔

طوالت کا خوف ضرور ہے مگر مختصر طور پر عرض کردوں کہ ۔

شریعت معروضات کی تین قسمیں بتاتی ہے۔ اول واجب ، فرض دوسرے سنت ، مستحب اور تیسرے مباح ، منکرات کی دو قسمیں ہیں حرام اور مکروہ ۔

ایسی تمام باتیں جو انسان کی فلاح وبہبود کا باعث حقیقی امن وسکون کا سبب اور معاشرہ اور سوسائٹی کی بہتری کا ذریعہ ہیں معروضات میں شامل ہیں اور وہ امور جو کسی طرح بھی انسان کو نقصان پہونچانے والے اور اس کے ضرر رساں ہیں وہ منکرات میں داخل ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ شریعت اور فقہ کے ماخذ کیا ہیں یہ کیسے معلوم ہو کہ کونسی بات معروضات میں ہے اور کونسی منکرات میں ۔ وہ ذرائع کون سے ہیں جن سے شریعت اخذ کی جاتی ہے اور تشکیل پاتی ہے ۔ عموماً برادران اہلسنت چار چیزوں پر زور دیتے ہیں۔ قرآن ، حدیث ، اجتہاد اور

قیاس اور اہل تشیع قرآن ، حدیث اور اجتہاد ہی پر اکتفا کرتے ہیں قیاس ان کے نزدیک گمراہی کا ذریعہ ہے۔ ایسا اجماع جس میں قول معصوم شامل ہو وہ مقبول ہے۔

ماخذ اول قرآن مجید۔

ذالک الکتاب لاریب فیه سب سے زیادہ مستند اور معتمد اور معتبر ذریعہ ہے اور تشکیل شریعت کا عظیم اور حقیقی سرچشمہ ۔

سنت

سنت دوسرا ماخذ ہے اپنی اہمیت اور افادیت میں لازمی اور لابدی ۔ قرآن تو اصول اور بنیادی باتیں وضع کرتا اور بتاتا ہے ساری تفصیلات اور تشریحات تو حدیث ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں اور ہمارے لئے واجب الاتباع اسلئے کہ قرآن کہتا ہے کہ " جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی " دوسرے مقام پر قرآن میں ہے ۔ " رسولؐ جو کچھ دیتا ہے لے لو اور جس سے منع کرتا ہے رک جاؤ " تیسری جگہ یہ ارشاد ہوا " اگر تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ سے محبت کرتے تو میری (رسول) کی پیروی کرو "

یہ تمام آیاتِ قرآنی رسولؐ کی اطاعت پر دلالت کرتی ہیں اسی لئے حدیث واجب الاتباع ہے۔ شیعہ مسلک رسولؐ ہی کی طرح آئمہ اثنا عشر کو بھی رسول کا نامزد کردہ رسولؐ کا پرتو اور رسولؐ ہی کی طرح معصومؑ اور من جانب اللہ مانتا اور جانتا ہے اس لئے حدیث کے معنی میں وسعت پائی جاتی ہے اور ہر امام معصوم کا ارشاد بھی حدیث ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ کا یہ ارشاد کہ

یا ایها الذین آمنو اطیعو الله واطیعو الرسول

واولی الامر منکم

" اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اور صاحب الامر کی "

صاف بتا رہا ہے کہ رسول اور اولی الامر کی اطاعت یکساں ہے اسی لئے مسلک جعفری میں اولی الامر وہی ہوسکتا ہے جو معصوم ہو اور اس کی اطاعت بھی رسول ہی کی اطاعت ہے۔ دوسرے مقام پر رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد کہ **من مات لم یعرف امام زمانه** ..... " جو امام زمانہ کی معرفت (یعنی ان کی اطاعت) کے بغیر مر گیا وہ کفر کی موت مرتا ہے " یعنی امام زمانہؑ کی اطاعت کے بغیر مرنا کفر کی موت مرنا ہے۔ اور آخر وقت رسول اکرمؐ کا یہ اعلان عظیم ترین حجت اور مسلمانوں کیلئے روشن ترین ہدایت ہے کہ میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری عترت اور اہلبیتؑ جب تک تم ان دونوں کی پیروی کرتے رہو گے گمراہ نہ ہوگے۔ یہ ہمارے لئے حجت ہیں کہ ہم رسولؐ ہی کی طرح آئمہ کی اطاعت بھی بجالائیں ۔ کیونکہ امامؑ کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اس مختصر سے پس منظر کے بعد ہم عنوان پر مجملاً بحث کرتے ہیں۔

یہ تو معلوم ہو ہی گیا کہ شریعت کے اجزاء کون کونسے ہیں اول قرآن اور دوسرے سنت اور تیسرے اجتہاد اور یہی ہمارا عنوان ہے۔

اجتہاد کیا ہے ؟

اس کا مادہ جہد ہے اور معنی کوشش کرنا۔ لغوی حیثیت سے کسی کام میں پوری پوری اور انتھک کوشش کرنے کا نام ہے۔ اسلئے اجتہاد کی تعریف یہ کی جاتی ہے ۔"وہ کوشش اور سعی جو احکام کا علم شرعی دلائل سے حاصل کرنے کے لئے کی جائے یعنی دین کے سرچشموں قرآن اور حدیث سے مسائل

کے استنباط کیلئے جو جدوجہد کی جاتی ہے اس کو اجتہاد کہتے ہیں۔"

اسی لئے علماء اہلسنت میں علامہ آمدی اپنی مشہور کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں اجتہاد کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

" ارباب اصول کی اصطلاح میں لفظ اجتہاد مخصوص ہے۔ اس انتہائی کوشش کیلئے جو کسی امر شرعی کے بارے میں گمان غالب حاصل کرنے کیلئے کی جائے کہ یہ حکم شریعت کے موافق ہے۔"

امام شافعی "الموافقات" میں اجتہاد کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

" اجتہاد نام ہے شرعی احکام معلوم کرنے اور ان کو حالات پر تطبیق دینے کیلئے انتہائی کوشش کرنے کا۔"

گویا اجتہاد نام ہے قرآن وحدیث کی روشنی میں شرعی مسائل معلوم کرنے کے لئے کوشش کرنے کا۔ اسی تعریف سے ظاہر ہے کہ اجتہاد صرف ان مسائل میں ہی کیا جاسکتاہے کہ جن مسائل میں شریعت کے واضح اور روشن احکامات موجود نہ ہوں اور جن مسائل کو قرآن مجید اور حدیث نے واضح طور پر معین کر دیا ہے ان کا اجتہاد سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی لئے اصول اوران فروع میں جو مسلمہ حیثیت کے حامل ہیں اجتہاد نہیں ہوتا۔

اجتہاد کی ضرورت

اسلام صرف چند اخلاقی ضابطوں اور مخصوص اعتقادات وعبادات کا نام نہیں ہے بلکہ دو انسانوں کی پوری زندگی اور شعبہ حیات پر محیط ہے اسی طرح کسی خاص وقت تک کیلئے محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کیلئے دین میں ہے۔ اگر اسلام ایک جامد دین ہوتا تو شاید اجتہاد کی ضرورت پیش نہ آتی جب تک انسانی زندگی کا سلسلہ جاری ہے۔ نئے نئے مسائل بھی ضرور پیدا ہوں گے ۔ پھر ان نت نئے مسائل کو کون حل کرئے؟ان کے لئے شرعی احکامات کون حاصل کرے؟اگر شریعت سے ان مسائل کیلئے احکامات حاصل

نہ کئے جائیں تو ظاہر ہے انسان کی ضروریات زندگی سے شریعت کا سلسلہ منقطع ہوجائے گا اور دین کامل پکامل نہ رہے گا۔ جو لوگ اجتہاد کے قائل نہیں ہیں ان کے لئے صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اسلام کو زندہ دین تصور نہیں کرتے۔ قیاس کے ذریعہ مسائل حل کرنے کا طریقہ اور انداز نہ صرف غلط ثابت ہو چکا بلکہ اسلامی راہ کے تعین کیلئے مضر اور غیر مفید بھی ۔

ہم تو یہ جانتے ہیں کہ مادی زندگی کیلئے جس طرح ہوا اور پانی ضروری ہیں ان کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح شریعت محمدیؐ کیلئے اجتہاد کی شدید ضرورت ہے ورنہ وہ مردہ دین ہوجائے گا۔

اس وقت بھی بہت سے ایسے مسائل پیش کئے جاسکتے ہیں جنہیں شریعت کو طے کرنا اور واضح حکم جاری کرنا ہے۔ موجودہ دور کے جدید تقاضوں نے تو اور زیادہ اجتہاد کی ضرورت کو روشن بنا دیا ہے۔ مثلاً ہماری پچھلی نشست میں کچھ مسائل کی نشاندہی ہوئی تھی ۔ ٹیوب کے ذریعہ سے بچے کی پیدائش ۔ یا غلطی سے مادہ منویہ کے ٹیوب میں تبدیلی سے بچہ کی خلقت وحرمت یا اقتصادی نظام میں ضروریات زمانہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے شریعت کے مسائل پر احکامات اور اسی قبیل کے دوسرے مسائل کیلئے کئے جائیں۔ظاہر ہے اجتہاد ہی کے ذریعہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے اور ہمارے مجتہدین فیصلے فرماتے رہتے ہیں۔

اجتہاد کون کرسکتا ہے ؟

کیا ہر معمولی لکھا پڑھا انسان اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہے؟نہیں اور ہرگز نہیں بلکہ مجتہد کیلئے جو شرائط پیش کئے گئے ہیں اگر ان کو دیکھا جائے تو چند باتوں میں ان کا خلاصہ پیش کیا جاسکتا ہے ۔

(۱) وہ شخص جو علم قرآن اور حدیث پر نہ صرف عبور رکھتا ہو بلکہ ان کے حقائق اور رموز وکتابات سے بھی اچھی طرح واقف ہو تاکہ استنباطِ مسئلہ میں

کوئی غلطی واقع نہ ہونے پائے۔

(۲) جس مسئلہ پر اجتہاد کیا جا رہا ہے اس کے دنیاوی پہلوؤں پر بھی نگاہ غائر ہو اور تمام معاملات و مسائل سے پوری طرح واقفیت ہو تاکہ حکم صحیح طور پر اخذ کیا جاسکے۔

(۳) وہ صاحب کردار ثقہ معتمد اور خواہشات نفس پر مکمل قابو رکھنے والا ہو ورنہ نفسانی خواہشات اور ذاتی مفاد کی خاطر فتویٰ صادر کرنے کا خوف رہے گا اور یہی وہ ضرورت اور شدید ضرورت ہے جس کے نہ ہونے کی بنا پر برادران اہلسنت کو اجتہاد کا دروازہ بند کرنا پڑا۔ کہ ہر ایک مفتی نے اجتہاد کرنا شروع کر دیا اور ہر غلط بات اور شدید ترین ناشائستہ حرکتوں کو بھی اجتہادی غلطی کے پردہ میں چھپانے کی کوشش کی گئی۔

تقلید کیا ہے ؟

اسکے دو معنی ہیں ایک لغوی اور دوسرے شرعی۔ لغوی کلاوہ در گردن بستن، ہار یا پٹہ گردن میں ڈالنا اور شر التقلید اتباع الرحل غیرہ فیما سمعه یقول ادنی فعله علیٰ زعم انه یحقق بلا نظر فی الدلیل "کسی آدمی کا اتباع کرنا ایسے فعل میں جو اسے کہتے ہوئے اور کرتے ہوئے دیکھ لے یہ سمجھ کر کہ وہ محقق ہے بغیر دلیل مانگے" اسی طرح دوسری جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ التقلید هو قبول قول بلا حجة "کسی کے قول کو بغیر حجت اور دلیل کے قبول کرنے کا نام تقلید ہے۔" یعنی جس کی تقلید کی جا رہی ہے اس کے سامنے کیوں ؟ کی گنجائش نہیں ہے یہی وہ بات ہے جس پر ہمارا پڑھا لکھا طبقہ ناک بھوں چڑھاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم خود عاقل اور ہوشمند ہیں ہم میں بھی فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہے لہذا مجتہد کے فتوے کو بلادلیل کیوں تسلیم کرلیا جائے۔

اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو بات واضح ہوجائے گی۔ صاحب اجتہاد کی

صلاحیت بیان ہو چکی ہے کہ کون اجتہاد کر سکتا ہے گویا ہر لحاظ سے یا ہر فن اور علوم پر حاوی۔ کیا ایک عالم اور غیر عالم برابر ہو سکتا ہے؟ دوسرے آپ کو یہ تو حق ہے کہ اس کے مجتہد ہونے اور نہ ہونے کی مکمل تحقیق کر لیں مگر جب آپ نے اپنی جستجو اور تحقیق کے بعد یہ فیصلہ کر لیا کہ ہاں یہ صاحبِ فتویٰ ہے تو پھر کیوں کی کوئی وجہ نہیں ۔ کیا آپ ایک ماہر ڈاکٹر کے نسخہ پر اعتراض کرتے ہیں کیا آپ ایک ماہر قانون کے کسی مقدمہ میں دلائل کو چیلنج کرتے ہیں اگر ایسا نہیں ہے تو کسی فقیہ اور مجتہد کے فتوے پر اعتراض سمجھ سے بالاتر ہے۔

مولانا کی مجلس چہلم بمقام بوتراب جامع مسجد، سامعین کا ایک گوشہ

پندرہویں صدی ہجری میں ملت جعفریہ کی ذمہ داریاں

عنوان اپنی کیفیت ، نوعیت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے نہ صرف مہتم بالشان ہے بلکہ ماضی اور حال کے آئینہ میں مستقبل کے گیسو سنوارنے کی بہترین کوشش بھی ۔ عصری تقاضوں اور ضروریات زمانہ کو ایسے سانچوں میں ڈھالنے کی تدابیر کرنا جو ہمارے نفسیات اور دینی ومذہبی امور سے مطابقت بھی رکھتے ہوں، فکروشعور کی بہترین دلیل ہوگی اور ہر انسان کا بنیادی حق اور اسکی فطرت کا عین تقاضہ ہے کہ وہ خود کو ، اپنے معاشرہ کو ، ماحول کو اور اپنے ملک اور دین وملت کو سنوارنے ، چار چاند لگانے اور عزت و عظمت بخشنے کی ہر ممکن جدوجہد انجام دے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ احساس ہےجوکسی قوم کی زندگی اور خوشحالی کی اساس اور بہترین سہارا ہے کہ " ملت کو کچھ ہونا چاہیئے " اور انسانی فضیلت کا یہ طرہ امتیاز بھی ہے کہ وہ موجود سے غیر مطمئن رہتا ہے اور غیر موجود کی تخلیق چاہتاہے ، خوب سے خوب تر کی تلاش اور جستجو ہی نے تو کائنات کے رازہائے سربستہ کو وا کیا اور یہ جہان آب وگل جنت نظیر اور فردوس بداماں نظر آنے لگا۔ آئیے ہم بھی غور کریں کہ پندرھویں صدی ہمیں کیا دے سکتی ہے۔ موضوع بڑا تفصیل طلب ہے اور ہمارے ماضی پر سیر حاصل بحث ہوچکی ہے لہذا میں

اسے ترک کرتا ہوں یوں بھی " پدرم سلطان بود " ترانہ ہی تو ہے!

مستقبل کے منصوبوں کو انتہائی خوبصورت الفاظ اور تخیل کی پرواز پر بہترین انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اگر لکھنے اور کہنے پر آئیں تو کیا کچھ نہیں لکھ سکتے اور کیا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ہمیں یہ یقین ہونا چاہیئے کہ آج کی دنیا حقیقت کی دنیا ہے صرف خیال وخواب کی باتوں اور وہم وگمان کے منصوبوں سے حقیقت پسندانہ طبیعتیں مطمئن نہیں ہو سکیتں۔ لہذا عنوان بالا پر صرف دلچسپ اور میٹھی میٹھی باتیں ہی نہیں بلکہ حقائق کی روشنی میں ایسی منزل کا تعین جو ہماری جدوجہد اور کوششوں کی دسترس سے پرے نہ ہو اور عملی قوتوں کیلئے جس کا حصول ممکن بھی ہو۔

ذہن میں ابھرنے والے چند سوالات۔

آج کا معاشرہ اور ماحول اور موجودہ زمانہ اور دنیا صرف مادی ترقی ہی کو ترقی اور معراج جانتی ہے معاشی اور اقتصادی خوشحالی ہی سب سے بڑی عزت وعظمت ہے کیا ہم دنیاوی اعتبار سے اپنا معیار زندگی بہتر اور برتر بنالیں تو کامیاب اور کامران ہوجائیں گے؟

کیا صرف ہر فرد کی ترقی اور ذات کی بلندی اور بہتری پر توجہ مرکوز کرنا کافی ہوگا یا اجتماعی اور ملی عظمت حاصل کرنے کے لئے بھی کوئی پروگرام بنانا ہوگا؟

ایک پہلو یہ بھی غور طلب ہے کہ جبکہ سائنس کی ترقی اور سریع السیر سواریوں نے ساری دنیا کو ایک ملک بنا ڈالا ہے اور تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات پیشگوئی کر رہے ہیں کہ پوری دنیا ایک شہر کی مانند ہوجائے گی، اپنے ملک کی ملت ہی کے لئے سوچ بچار کرنا کافی ہوگا، یا غیر ملکیوں کے لئے بھی۔ ہم نے آج تک اپنی ملت کی آدھی آبادی سے کوئی مفید کام نہیں لیا یعنی خواتین کو بھی کچھ ذمہ داریاں سونپنا مناسب ہوگا؟ یا وہ اپنی توانائیاں

صرف کھانا پکانے اور باتیں بنانے میں ہی ضائع کرتی رہیں گی۔

ایک اور بات زمانہ بدل گیا، بدل رہا ہے اور بدلتا رہے گا اور تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہو رہی ہیں لوگوں کا یہ خیال کہ ہمیں بھی بدل جانا چاہیئے ورنہ سکوت اور جمود موت ہے کسی حد تک درست ہو سکتا ہے مگر تغیرات تو دوامی ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں آج کچھ ہے کل کچھ جو کیفیات موجودہ وقت میں ہیں کیا کل بھی یہی ہوں گی؟ لہذا زمانہ کے ساتھ ہم کب تک بدلتے رہیں گے اور دوسرے یقیناً ہمیں حرکت کرنا چاہیئے اور ضرور کرنا چاہیئے مگر یہ حرکت اس وقت درست اور مناسب ہوگی جب کہ ہم منزل کا تعین کرلیں اور صحیح سمت طے پاجائے ورنہ مخالف سمت میں گاڑی چل پڑی تو کیا واپس ہونا اپنے بس میں اور ممکن ہوگا؟ ذرا سنجیدگی سے ان مسائل کا تجزیہ کیا جائے اور صحیح سمت کی نشاندہی کی کوشش کی جائے۔

انسان اس کرہ ارض پر سب سے بہتر، افضل اور اشرف مخلوق ہے اس کی قدرتیں اور اعلیٰ صلاحیتیں عدیم النظیر، اسکی تجسیم و تشکیل لاجواب، انسان ہی ہے جو کائنات کو مسخر کرنے اور اس سے بہتر سے بہتر کام لینے کی قوت رکھتا ہے اس نے اپنی عقل وخرد اپنی دانائی اور بینائی کا سارے جہان سے لوہا منوالیا۔ اگرچہ کائنات اپنی وسعت کے اعتبار سے بے پایاں اور انسان اس کے مقابلہ میں حقیر اور بہت چھوٹا سا۔ لیکن اس کے باوجود اس کو ناز ہے جو چیز انسان کے پاس ہے اس کا زبردست حریف (کائنات) اس سے محروم ہے۔ یعنی "فعال ذہن" انسان فطرت کے مقابلہ میں کتنا ہی ذرا سا ہو لیکن وہ ایک باشعور ہستی ہے اور فطرت احساس وشعور سے محروم، اسلیئے انسان بہتر اور افضل۔ اسی لیئے مالک کائنات نے کہا۔

سخر لکم مافی السموات وما فی الارض جمیعاً

ے انسان جو کچھ زمین وآسمان میں ہے وہ سب کا سب
تیرے لئے مسخر کردیا گیا ہے" یعنی مطیع بنادیا گیا ہے۔

انسان مختار اپنی مرضی کا، مالک اپنے ارادہ اور نیت کا، غلط راہ اختیار کرے یا صحیح، حیوانیت اور بربریت کو اپنائے یاانسانیت کو، دنیا کا ہو کر رہ جائے یا دین کو اپنالے لیکن یہی تو وہ دوراہا ہے جہاں انسانیت کے جوہر کھلتے ہیں اور وہ اپنی تمام توانائیوں کا مظاہرہ اور عقل وشعور سے کام لے کر یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوجائے کہ کونسی راہ بہتر اور کونسا طریقہ کار ضرر رساں ہے۔

آج کی جدید تحریکیں لادینیت، مادیت، اشتمالیت ہو یا اشتراکیت یہ مذہب کو افیون کی گولی تصور کرنے والے اور رات دن اس کا مذاق اڑانے والے ان کا حال ہمارے سامنے ہے۔ جدید تہذیب نے انسان کو کیا دیا۔ پروفیسر جُوڈ کے خیالات پڑھیے وہ کہتا ہے " سائنس نے ہمیں پرندوں کی طرح فضا میں اڑنا سکھا دیا، مچھلیوں کی طرح سمندر میں تیرنا جان گئے مگر انسان کی طرح زمین پر رہنا نہیں سکھا سکی۔" یہ جدید تہذیب کی کامیابی کا مکمل تجزیہ ہے۔

مذہب سے دُور تہذیبیں اور تحریکیں دوَر سے مادی طور پر تو بہتر نظر آتی ہیں لیکن روح کی تسکین کے اسباب مہیا نہیں کرسکیں جس کی وجہ سے ساری دنیا میں اضطراب اور بے چینی کی ایک لہر موجزن ہے آخر تمام مادی آسائشوں کے باوجود قتل، غارتگری، چوری، اسمگلنگ، عورت کی بے حرمتی کیوں؟

یوں بھی انسان روح اور مادہ کا مرکب اور مجموعہ ہے اور ان دونوں سے مل کر عالم وجود میں آیا ہے اوران دونوں کی علیحدہ حیثیتیں اور ضرورتیں ہیں جس طرح روٹی، کپڑا اور مکان انسان کی بنیادی ضروریات ہیں اور ان

کے بغیر اضطراب اور بے چینی لازمی اور ضروری ہے ۔ تو کیا روحانی ضرورتوں کو پورا کئے بغیر اطمینان نصیب ہو سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں۔

مذہب انسان کی روحانی ضرورت ہے اس کی فطرت کا تقاضہ اور ضمیر کی آواز ہے جس طرح لادینیت کے شیداء اور مادیت کے پرستار اطمینان وسکون حاصل نہ کرسکے اس طرح اشراق اور وجدان کے شیدائی اور صرف روحانیت کے فدائی زیادہ دیر کامیاب نہ رہ سکے۔ کامران اور کامیاب وہی نظام ہو سکتا ہے جو روحانی اور مادی دونوں ضروریات کو پورا کرے ۔ جو دین کیلئے نہ دنیا کو اور دنیا کیلئے نہ دین کو ترک کرے ۔ بلکہ دونوں کے حسین امتزاج کو سرمایہ حیات تصور کرے ۔ اور ہمیں قرآن نے یہی بتایا ہے کہ یوں دعا مانگو

ربنا آتینا فی الدینا حسنة وفی الاخرة حسنة

وقنا عذاب النار

پالنے والے دنیا کی نیکیاں بھی عطا کر اور آخرت کی عظمتیں بھی اور جہنم کی آگ سے محفوظ کر دے۔

(البقرہ ۲۰۱)

گویا رب العالمین کی ہدایت ہے کہ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلو اور دونوں جہان میں کامیابی کی کوشش ہی صحیح انسانیت ہے۔ اسلام نے جہاں یہ سبق دیا کہ **المال والبنون زینة الحیواة الدنیا** " مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی زیب وزینت ہیں ۔ " گویا کوئی قابل فخر بات ہیں ۔ وہاں یہ بھی کہا **ولاتنس نصیبک فی الدنیا** " دیکھو دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولنا۔ " گویا عام انسان کی کامیابی اور اس کی منزل مراد یہی ہے کہ وہ دین اور دنیا دونوں میں ترقی کی کوشش کرے ۔ لہذا ملت جعفریہ کی کامیابی اور کامرانی کا مقصود بھی یہی ہونا چاہیئے کہ ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جو دین اور دنیاوی دونوں ترقیوں کا ضامن اور

نگہبان بن سکے۔

یوں بھی ہم ملت جعفریہ کی عظمت کے خواہاں ہیں کسی عام جماعت کیلئے کوئی پروگرام نہیں بنا رہے ہیں جب ہم نے اپنے آپ کو جعفری مسلک سے منسلک کر دیا تو ہمیں وہی راہ تو منتخب کرنا ہوگی جو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے معیّن کی ہے اور امامؑ کا طریقہ کار وہی ہے جو قرآن مجید کا طریقہ کار ہے۔

دوسرا سوال یہ تھا ۔ کیا ہر فرد اپنی ذات کو بلندو بالا بنانے کی کوشش کرے ؟ اجتماعی ترقی ضروری نہیں ؟ آج کے دور میں کوئی باشعور آدمی شاید ہی اس خیال کا حامی ہو ۔ ویسے عمل اسی نظریہ پر ہو رہا ہے اور ہر شخص نفسا نفسی میں مبتلا نظر آتا ہے خاص طور پر وہ حضرات جن کے پاس کچھ ترقی کے ذرائع اور وسائل بھی موجود ہیں وہ تو ملت کی سربلندی کے لئے کوئی پروگرام بنانا تو بڑی بات ہے سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن اپنی ہی ذات میں مگن افراد جب کسی پریشانی اور مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو پھر سہاروں کی تلاش اور وسائل کی جستجو میں ایسے سرگرداں نظر آتے ہیں کہ بس ان کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

پھر سب سے بڑا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہم کھائیں اچھا، پہنیں اچھا، اور بہتر مکان میں رہ لیں یہ کوئی انسانیت نہیں یہ تو ہر حیوان کی خواہش اور اس کی جبلت ہے پھر حیوان سے انسان کو کونسی چیز ممتاز کرے گی ۔ یوں بھی انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے ، احتیاجات کا بندہ ہے اور اغراض میں مبتلا ۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے سارے کام خود تن تنہا انجام دے لے ہوتا یہ ہے کہ ہر شخص اپنا ایک حلقہ احباب اور دوستوں کاایک گروپ تشکیل دے لیتا ہے اور اس کے توسط اور ذریعہ سے ذاتی ضرورتوں کا مداوا کرتا ہے۔ تو گویا کسی بھی مشکل اور کسی بھی مد میں اجتماع کی ضرورت تو

پیش آئی اب اگر اسی گروپنگ کو بلند اور عظیم مقاصد کے لئے وسعت دے دی جائے تو قرین عقل نہ ہوگا ۔ ہم فرد کی اہمیت اور عظمت کے قائل ہیں اور اسلام نے ہر فرد کو اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے ہم فرد کی اکائی ختم نہیں کرنا چاہتے بلکہ فرد کو اجتماعیت سے روشناس کراکے زیادہ سے زیادہ فعال اور مفید بنانا چاہتے ہیں۔ کسی نے کتنی اچھی بات کہی کہ " آدمی انسان اس وقت بنتا ہے جب وہ اپنی ذات کو ایسے مقصد سے وابستہ کرلے جو خود اس کے وجود سے بلند تر ہوں جو شخص اعلیٰ مقصد اور نیک زندگی بسر کرتا ہے وہ ساری انسانیت اور سارے زمانہ کیلئے زندگی گزارتا ہے۔ انسانی مسرت اور دلجوئی کا راز خودغرضی اور نفس پرستی میں نہیں بلکہ ایسے نصب العین کی تلاش اور جستجو میں مضمر ہے جو اپنی ذات کے سوا دوسروں کی بھلائی اور بہتری کی کوششوں سے تعلق رکھتے ہوں ۔ "

حقیقت یہ ہے کہ اپنے اور اپنی اولاد کیلئے تو سب ہی جیتے اور مرتے ہیں ۔ انسان وہ ہے جو دوسروں کے لئے مرنا جینا سیکھے اور یہی انبیاءؑ ومرسلین اولیا اور صالحین کی راہ ہے۔ معصومؑ کا ارشاد ہے کہ اپنے کسی بھائی کی دلجوئی کیلئے مسکرا دینا بھی نیکی ہے۔

اور کیا اجتماعی ترقی اور عظمت میں فرد اور ذات کی ترقی شامل نہیں ہے؟ صرف تصور کی بات ہے ورنہ ملی شکوہ ہمارا ہی شکوہ ہے۔

عزائم اور ارادے

تیسری بات کیا پوری ملت جعفریہ کیلئے پروگرام بنایا جائے یا صرف پاکستان میں رہنے والے اور بسنے والوں کے لئے ۔ دل تو چاہتا تھا کہ ساری دنیا کے شیعہ ملت واحدہ کی حیثیت اختیار کرلیتے اور پھر امت مسلمہ کی قوت وطاقت بنتے ۔ زمانہ اور سائنس کی ترقی نے یہ بات بہت آسان بھی بنا دی ہے ۔ پوری دنیا ایک شہر کی مانند سمٹ رہی ہے اور ساری دنیا کی آبادی

ایک خاندان کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے ۔ ایسے ماحول اور دور میں عامی موتمر جعفریہ کا انعقاد اور انصرام کوئی خاص مشکل اور کٹھن کام نہ تھا اور پھر جب کہ آج اسکی شدید ضرورت بھی ہے لیکن مور اپنے پیر دیکھ کر خود گردن جھکا لیتا ہے۔ ہمارے وسائل اور ذرائع محدود، قوتیں اور کوششیں ناکافی، اسلئے پروگرام میں یہ بات تو ضرور رکھنی چاہیئے اور اخلاقی حیثیت سے ہمارا ہر اس عالمی تحریک سے تعاون ہونا چاہیئے جو ملت کی سرفرازی اور عظمت کیلئے کام کر رہی ہے مگر میدان عمل اس وقت صرف اپنے ملک ہی کو بنانا بہتر ہے۔ اور یوں بھی کہ اگر ہم اپنے گھر کو بہتر بنانے میں کامیاب ہوگئے تو دوسرے بھی اس سے ضرور اثر انداز ہوں گے۔

چوتھا سوال بھی کم اہم نہیں ۔ خواتین بھی ملت کی فلاح اور بہبود کیلئے کوئی کام کر سکتی ہیں یا نہیں ۔ میں آزادی نسواں کے عنوان پر کوئی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ ملت کی آدھی آبادی سے کوئی مفید ترین کام لینے کی فکر میں مبتلا ہوں ۔ لیکن مجھے ایک خیال ضرور ستا رہا ہے کہ ملت کے فلاحی پروگرام میں حصہ لیتے لیتے یہ جنس زینت خانہ کی بجائے شمع محفل نہ بن جائے۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو ہم چاہیں یا نہ چاہیں شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر ہم نے اپنی غیرت اور حمیت کا پردہ خود چاک چاک کر دیا ہے۔ ڈولیوں میں سفر کرنے والی شریف زادیاں صدر اور زیب النساء اسٹریٹ پر یوں محو خرام نظر آتی ہیں کہ پیرس اور لندن کی حسین تتلیوں کو شرم آجائے۔ اب ہماری تقریبات میں یہ پردہ نشین، مردوں کے دوش بدوش یوں دکھائی دیتی ہیں کہ آپ شرم سے خجل ہوجائیں تو ہوجائیں مگر کیا مجال کہ ان کو ذرہ برابر بھی احساس ہو کہ ہم کہاں ہیں۔ کیا جلوس کا منظر ہماری نگاہ کے سامنے نہیں ۔ شاہزادیوں کی اسیری اور بے چادری پر آنسو بہانے والیاں ۔ خود تماشہ بنی ہوتی ہیں ۔ تو ایسی صورت میں انہیں اپنی ذات کا اپنی ملت کا

اپنی اقدار کا احساس دلانا مفید نہ ہوگا ؟

اور یوں بھی کہ یہ ایک کلیہ ہے کہ وہ جماعت وہ ملت اور قوم جس نے کبھی کوئی کام نہ کیا ہو جس کی توانائیاں محفوظ ہوں جس کے کام کرنے کے جذبہ اور جوش بروئے کار نہ آئے ہوں وہ بہتر اور زیادہ اچھی طرح جوش اور ولولہ سے کام کر سکتی ہے۔ ملت جعفریہ کے مرد اور خصوصاً وہ لوگ جنہیں کام کرتے کرتے وقت بیت چکا ہے زیادہ بہتر طور پر میدان عمل میں کودنے سے جھجک محسوس کرتے ہیں اسی لئے کسی ملت کے نوجوان ہی بہتر طور سے ذمہ داریاں پوری کرنے کی ضرورت اور صلاحیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کے عمل کی توانائیاں محفوظ ہوتی ہیں اس نظریہ کی بنیاد پر اگر خواتین سے بجائے ان کے گیسو سنوارنے کے ملت کے گیسو سنوارنے کی خواہش کی جائے اور اپنے پیچھے پیچھے آئین اور ضوابط کے حدود میں لیکر چلا جائے تو کیا ملت کی سرافرازی کیلئے بہتر نہ ہوگا۔ بہرحال جلدی نہیں ہے فیصلہ انتہائی غوروخوص کے بعد ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اگر یہ ممکن بھی ہوا تو آپ ان کے لئے میدان عمل کا تعین کریں گے انہیں مطلقاً اور کلی آزادی نہیں دیں گے ، ایسے کام سونپیں گے جو ان کے شایان شان ہوں ۔

بہرحال ان چند سوالات کے حل کے بعد یہ سوچنا ہے کہ پروگرام کیا ہو اور اسے عملی جامہ کون پہنائے اور کیسے پہنایا جائے اور اگر یہ کوشش اور جدوجہد نہ کی گئی تو انجام کیا ہوگا ؟

آج سے تقریباً پانچ چھ سال قبل " مجلس ملی " کی جانب سے ایک کتابچہ شائع ہوا تھا۔ " غور فرمائیے کہ ہم کہاں ہیں " جسے اہل بصیرت نے بہت زیادہ پسند فرمایا تھا۔ جس میں پاکستان میں ہماری کوششوں کا جائزہ لیا گیا تھا اور تجزیہ کرکے بتایا تھا کہ اس ملک میں ہم نے ترقی معکوس کی ہے ۔ آج پھر وہ کتابچہ دیکھا جاسکتا ہے۔ اور اسے سامنے رکھ کر پروگرام بنایا جاسکتا

ہے۔

ملت کی عظمت اور ترقی کے لئے چار عناصر انتہائی ضروری ہوتے ہیں
(۱) مذہبی اور دینی عظمت (۲) اقتصادی خوشحالی (۳) علمی اور تعلیمی برتری
(۴) اخلاق اور کردار کی تعمیر

اگر کوئی جماعت اور قوم ان عناصر اربعہ میں کمال نہ صحیح صرف حالات ہی بہتر بنالے تو اس کے روشن مستقبل کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ ان چاروں بنیادی ضرورتوں کو تفصیلاً پیش کیا جائے۔ اور ان میں کارکردگی کا جائزہ لیا جائے۔

" غور فرمایئے ہم کہاں ہیں " میں جائزہ پیش کردیا گیا ہے۔ میرے خیال سے حالات اس وقت سے اب کچھ بدتر ہوں گے ،!!اا نہیں ، پھر اب کیا کیا جائے مایوس ہو کر بیٹھ جائیں ، ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر صرف باتیں بناتے رہیں ایک دوسرے کو گالیاں دیتے رہیں اور کیچڑ اچھال کر غیروں کی نگاہ میں مضحکہ خیزی کا ذریعہ بنے رہیں۔ ملت کی ساکھ کو دن بدن نقصان پہونچ رہا ہے اور ہم خواب خرگوش میں مدہوش ، یا پھر صرف لن ترانیاں جاری ، یا خود ستائی شعار ، عملی طاقتیں شل ، قوت کارکردگی مفلوج ، زمانے سے کسی نے شاید ہماری تصویر ہی اس اقتباس میں پیش کی ہے۔

" قوموں کے زوال کے اسباب میں یہ بات مشترک طور پر ملتی ہے کہ وہ اس وقت نیچے گرتی ہیں جب وہ اپنے عمل کی تجدید نہیں کرسکتیں بعض اوقات وہ علم اور نیکی کی مدعی بنتی ہیں اور دوسری سب قوموں کو ذلیل بھی سمجھتی ہیں کبھی وہ غرور میں اپنی تہذیب کو الہیٰ نواسس کے عین مطابق اور دوسروں کو گمراہ بتاتی ہیں اور اپنے آپ کو خدا کا منتخب سمجھنے لگتی ہیں ۔ انکے تہذیب وتمدن کے ادارے بجائے زندگی کی تنظیم کے ذریعہ ہونے کے مقصود بالذات بن جاتے ہیں جو حاصل ہوگیا کافی ہے ماضی پرستی بت پرستی

کی شکل اختیار کرلیتی ہے اس طرح نئے احوال سے مطابقت کی قابلیت سلب ہوجاتی ہے اور وہ زندگی کا صحیح توازن کھو دیتی ہیں یہ بات تاریخ کے فطری جبر کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ انسانی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے قومیں قتل نہیں کی جاتیں بلکہ ہمیشہ خود کشی کرتی ہیں جس کی ذمہ داری سوائے خود ان کے کسی اور پر نہیں ہوسکتی ۔"

یہ تھا ایک عام تبصرہ جو قوموں کے زوال سے متعلق پیش کیا گیا ہے اس آئینہ میں کہیں ہمیں اپنی تصویر تو نظر نہیں آرہی ہے ؟ یاد رکھئے زوال خدا کی جانب سے نہیں ہوتا نہ وہ زمانہ کی گردش کا نتیجہ ہوتا ہے بلکہ جماعتوں کی زندگی اور ان کی کارکردگی میں زوال کے اسباب موجود ہوتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ یہ بات بھی یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر قومیں چاہیں تو عمل صالح اور بہتر کارکردگی سے اپنی عمروں میں اضافہ کرسکتی ہیں کیونکہ قوموں کی عمر فرد کی عمر کی طرح محدود نہیں ہوتی ۔

یہ ساری باتیں اسلئے پیش کی گئی ہیں کہ پروگرام بنالینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس پر عمل اور صحیح سمت میں عمل اور اخلاص کے ساتھ عمل ضروری ہے۔اب وہ پروگرام جس کے ذریعہ منزل مقصود تک پہونچنا سہل ہوسکتاہے۔

یاد رکھئے پاکستان ایک مستقل اور اسلامی حکومت ہے اور ایسی حکومت جو اسلامی دنیا کی مذہبی نہ سہی دوسری بہت سی قسموں کی رہبری کر رہی ہے اور کرتی رہے گی ۔ اسلئے ہمیں انتہائی دانشمندی کے ساتھ بڑی منصوبہ بندی کرتے ہوئے راہ عمل کا تعین کرنا ہوگا۔

کچھ امور ضروری اور فوری انجام دینا ہوں گے اور کچھ طویل المیعاد منصوبہ بندی کے ساتھ،فی الحال صرف کراچی کیلئے۔

(۱) سب سے پہلے ایک مرکز ایک پلیٹ فارم ۔ لیکن کسی جماعتی شکل میں

نہیں ۔ کیونکہ ملت نے اتنی جماعت سازی کی ہے کہ ہم اپنا اعتماد کھو بیٹھے ہیں ۔ جماعت بنتی ہے، چند روز بڑی دھوم دھام سے جلسے اور جلوس ہوتے ہیں، آن بان سے پروگرام بنائے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ جماعت کا نام تو رہ جاتا ہے کوئی کام نہیں ہوتا۔ جماعت کا نام ہو، کام کرنے والے کام کریں مگر عہدہ داریاں اور چودھراہٹیں تقسیم نہ ہوں کیونکہ یہی تنظیم کی موت کا پیغام لاتی ہیں ۔

(۲) ایک بیت المال کا قیام ، قوم کی مقتدر اور معتمد ترین شخصیتوں کو اعتماد میں لے کر ان کی زیر سرپرستی افتتاح اور زکواۃ و خمس کے نظام کا نفاذ ۔

(۳) ترقی کے چاروں شعبوں کی نگرانی اور ضروری امور کی انجام دہی کیلئے۔ چار کمیٹیوں کی تشکیل اور ان کے لئے سرمایہ کی فراہمی کا بندوبست ۔

(۴) کراچی میں زندگی کے عام شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی فہرست اور ان سے رابطہ پیدا کر کے ملی امور پر مذاکرے اور تبصرے ۔

(۵) ایک ایسی کمیٹی کی تشکیل جو حکومت اور ملت کے درمیان رابطہ کا کام انجام دے۔ تاکہ غریبوں کو در در ٹھوکریں کھانے سے محفوظ رکھا جاسکے۔

ہر جگہ اجتماعی سکونت کی کوشش اور اپنی مستقل کالونیاں بنانے کا اہتمام تا کہ عددی طور پر برتری محسوس ہوسکے۔ فوجی اداروں بری ، بحری اور فضائی فورسز میں ملازمتیں حاصل کرنے کی سعی ۔

طویل المیعاد منصوبے

نجف جدید کی تعمیر ۔ جہاں ہماری دینی اور دنیوی تعلیم گاہیں ہوں ۔ اپنی ثقافت اور تہذیب کے ادارے ۔ مستقل کالونی ۔ اور اقتصادی امور کی انجام دہی کے لئے زراعتی فارم ۔ پولٹری اور دوسری گھریلوں صنعتوں کا اہتمام ۔ اور ایک دو صنعتیں جو ملت کا مستقل اثاثہ اور قوم کی ضرورتوں کا مداوا کر سکیں۔

یہ کام جس قدر مشکل اور دشوار نظر آتا ہے اتنا دشوار نہیں ہے اگر پانی اور زمین کا انتظام ہوجائے تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔

لیکن ہاں لاکھوں روپے کی نہیں کروڑوں ، اربوں روپے کی ضرورت ہوگی مگر قوم کا مستقبل سنور جائے گا اور پاکستان میں ہماری عظمت کا سنگ میل قائم ہو جائے گا۔

یہ سب کام کون کرے گا؟ کچھ جنونی اور مذہبی دیوانے اور ایسے انتھک کارکن جو نام و نمود اور ذاتی نمائش کے متمنی نہ ہوں بلکہ صرف اور صرف اللہ، رسولؐ اور آئمہ معصومینؑ کے مشن کی تکمیل کیلئے اپنے آپ کو وقف کردیں اور انسان کا حقیقی نصب العین بھی تو یہی ہے ۔

ان صلواتی و نسکی ومحیای .... الخ

بے شک میری نماز ، قربانی ، زندگی اور موت سب کچھ عالمین کے پالنے والے خدا ہی کے لئے ہے۔

تعلیم کی تاریخی روئیت

دور نبویؐ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ملت اسلامیہ کے سب سے پہلے معلم اور استاد تھے آپ ہی نے پہلی منظم تعلیمگاہ مدینہ منورہ میں قائم فرمائی صفہ نامی چبوترہ پہلا مدرسہ تھا اور اصحاب صفہ اس کے پہلے طالب علم تھے۔ اس مدرسہ میں ۷۰ ۔ ۸۰ تک طالب علم تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ دوسرے صحابہ کبار بھی یہاں معلم کے فرائض انجام دیتے۔ اصحاب صفہ میں سے ایک حضرت معاذ بن جبل مالی امور کے نگراں تھے اور عطیات کی تقسیم کا کام انہیں کے سپرد تھا ان متعلمین میں سے مختلف افراد اسلامی حکومت کی مختلف خدمات کے لئے مامور کردیے جاتے تھے اور تعلیم و تبلیغ کیلئے تو خصوصیات کے ساتھ انہیں اصحاب کو بھیجا جاتا تھا۔ اپنی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے یہ طلبہ خود بھی محنت کرتے اور کماتے ۔ اسلام کے اس پہلے مدرسہ سے جو روایات قائم ہوئیں وہ یہ ہیں ۔

(۱) اولین چیز دینی تعلیم ہے قرآن اور سنت نبویؐ کو نصاب تعلیم کا محور اور مرکز ہونا چاہیئے ۔

(۲) تعلیم کا مقصد اچھا مسلمان اور داعی الی الحق بنانا اور مسلم معاشرہ کی ساری ضروریات کو پورا کرنا ہے۔

(۳) رسول کریمؐ نے تعلیم اور مسجد کا تعلق قائم کیا مسجد دینی محور ، سیاسی مرکز اور تعلیمگاہ بنی اور اس کے ذریعہ طالب علم ایک مخصوص ورثہ کے امین بنے۔

(۴) متعلمین کے لئے اپنی ضروریات پوری کرنے کیلئے خود محنت مزدوری

کرنا اور مختلف کاموں کو سیکھنا پسندیدہ فعل قرار پایا۔

(۵) تعلیم کی آخری ذمہ داری مسلمان معاشرے اور اسلامی ریاست پر عائد ہوتی ہے اور اسے اس مقصد کے لئے اپنے وسائل استعمال کرنے چاہئیں مسلمانوں کی قومی آمدنی اور بیت المال پر اولین حق زیر تعلیم طلبہ اور ان پر ہونے والے جملہ مصارف کا ہے۔

رسول اکرمؐ کے زمانہ میں ابتداء ہوئی اور پھر اسی انداز پر اسلامی دنیا میں تعلیم کا رواج زیادہ سے زیادہ ہوتا گیا۔ مساجد تعلیم کا مرکز بن گئیں ایک ایک مسجد میں کئی کئی مبلغ ہوتے اور ہزاروں طلباء شریک ہو کر درس حاصل کرتے پہلی چار صدیوں میں تعلیم کا اسی انداز سے رواج رہا اسی لحاظ سے مساجد کی تعمیر میں دالانوں اور ان کے ساتھ حجروں کی تعمیر کا اہتمام کیا جاتا اس دور کی اہم تعلیمگاہوں میں سے مصر کی جامعہ ازہر اور تیونس کی جامعہ زیتون آج بھی موجود ہیں جو بہترین یادگاریں ہیں مساجد کے علاوہ خانقاہیں ۔ علماء کے مکانات ، کھلے میدان بھی تعلیم گاہ کی حیثیت رکھتے تھے جہاں طلباء کو مفت تعلیم دی جاتی تھی ۔

مسلمانوں کے دوسرے دور کا آغاز پانچویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے۔ اب مساجد کے علاوہ مدارس بھی تعمیر ہوئے اور بڑے زور وشور سے انکا اہتمام ہوا۔ غالباً سب سے پہلا مدرسہ جس کی اپنی عمارت ، سرکاری گرانٹ اور وقف املاک برائے اخراجات اور تعلیمی نصاب باقاعدہ مرتب تھا ، سلطان محمود غزنوی نے اپنے پایۂ تخت غزنی میں ۴۱۰ ھ مطابق ۱۰۱۹ ء میں قائم کیا۔

دوسرا اہم مدرسہ جس نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا دولت سلجوقیہ کے مشہور وزیر اعظم نظام الملک طوسی (المتوفی ۴۸۵ ھ) کا قائم کردہ مدرسہ نظامیہ ، بغداد ہے جسے امام غزالی جیسے صدر مدرس کی سرپرستی حاصل رہی ۔

اسکے بعد مدارس کی بہتات ہو گئی اور اسلامی ملکوں میں ان کا جال بچھ

گیا ان میں ایسے عظیم الشان مدارس بھی تھے جن کے تحت متعدد مدارس کام کرتے تھے اور ان کی حیثیت آج کی اصطلاح میں یونیورسٹی کی سی تھی۔

برصغیر میں تعلیمی روایت کا ارتقاء

ہندوستان پر مسلمان فاتحوں کا قبضہ مکمل ہونے میں کافی وقت صرف ہوا۔ صحیح طور سے مسلمانوں کی حکومت کا آغاز معزالدین محمد بن سام کے ہاتھوں ہوا۔ قطب الدین سے بہادر شاہ ظفر تک تقریباً ساڑھے سات سو سال مسلمان ہندوستان پر حکمراں رہے اور اس دور میں مسلمانوں نے اپنے نظام تعلیم کو نشوونما دینے میں پوری کوشش کی اس دور کے تعلیمی نظام اور سرگرمیوں کے مطالعہ سے جو اہم چیزیں سامنے آئیں ہیں ہم ان کا یہاں مختصر تذکرہ کریں گے۔

(۱) تعلیم کا جو مزاج قرون اول میں تشکیل پایا تھا یہاں بھی اس کو بڑی حد تک قائم رکھا گیا تعلیم کا مرکز دین اسلام رہا اور تمام تعلیمی سرگرمیاں اسی محور کے گرد گھومتی رہیں تعلیم کو ایک عبادت تصور کیا گیا۔

(۲) برصغیر میں شروع ہی سے باقاعدہ مدارس کا نظام قائم ہوا لیکن تعلیم کا ذریعہ صرف مدارس ہی نہ تھے ابتدائی تعلیم گھروں پر ہوتی تھی لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام بھی گھروں پر ہی تھا پھر قدیم اسلامی روایت کے مطابق مساجد تعلیم کا بہت بڑا مرکز رہیں۔

(۳) ایک بڑی بات یہ ہے کہ گو دینی تعلیم پورے نظام کا محور تھی لیکن دوسری ضرورتوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا گیا صنعتی تعلیم کا انتظام کارخانوں میں تھا اور تجارتی تعلیم کے لئے مہاجنی اسکول تھے۔ جہاں تجارتی ہندسہ اور تجارت کے ابتدائی اصولوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فنون سپہ گری کی تعلیم کے لئے بے شمار ادارے اور اکیڈمیاں تھیں۔

سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ مطابق ۱۳۲۴ء تا ۱۳۵۱ء) کے

زمانے کے بارے میں ایک مورخ (مقریزی) کی روایت ہے کہ سلطان محمد تغلق کے عہد میں دہلی کے اندر ایک ہزار اسلامی مدارس تھے جن میں 'شواقع' کا بھی ایک مدرسہ تھا۔ مدرسین کے لئے شاہی خزانے سے تنخواہیں مقرر تھیں تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک حافظ قرآن اور عالم ہوتیں مدارس بھی علوم دینیہ کے علاوہ معقولات اور ریاضی کی تعلیم دیجاتی ۔

عہد عالمگیر کا مشہور مغربی کپتان الیگزینڈر ہمٹن اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ سندھ کے شہر ٹھٹہ میں مختلف علوم وفنون کے چار سو مدرسے تھے اسی طرح قطب الدین ایبک سے لے کر بلبن تک جو حکمراں گزرے ہیں انہوں نے بڑے پیمانے پر مدرسے قائم کئے اور مساجد تعمیر کرائیں ۔

بہمنی اور دکنی حکومتیں بھی تعلیم پر کثیر رقم خرچ کر رہی تھیں ، مغل بادشاہوں میں ایک سے ایک تعلیم کی ترویج میں بڑھاہوا تھا۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی صوبہ اودھ کا حال لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں

" پورے صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد کے بڑے حصہ میں پانچ پانچ کوس ، زیادہ سے زیادہ دس دس کوس کے فاصلہ پر شرفاء اور عالی خاندان لوگوں کی آبادی ہے جو سلاطین وحکام کی طرف سے تنخواہ وجاگیر مددِ معاش کے طور پر رکھتے ہیں انہوں نے مساجد ، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کر رکھی ہیں اور اساتذہ ومدرسین ہر جگہ علمی فیض رسائی میں مشغول ہیں اور انہوں نے طلب علم کا ایک جذبہ اور ولولہ پیدا کر رکھا ہے طلباء گروہ درگروہ اور فوج درفوج ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں اور جہاں مناسب سمجھتے ہیں تعلیم میں مصروف اور منہمک ہو جاتے ہیں۔"

آخر میں ایک بات یہ کہ تعلیم ہمیشہ مفت رہی نہ صرف تعلیم بلکہ طلباء کے رہنے سہنے کھانے پینے کا انتظام بھی منتظمین درسگاہ کے ذمہ ہوتا تھا۔

اس نظام کی ایک اور خصوصیت استاد اور شاگرد کا قلبی تعلق تھا تعلیم کے محور استاد تھے اور شاگرد کی حیثیت ایک اچھے متعلم اور شفیق اطاعت گزار کی سی تھی ۔ اساتذہ کا کردار مثالی ہوتا تھا اور طلباء کو درس دیتے اور ہمیشہ استاد اپنے شاگردوں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ استاد طلباء کے تزکیہ نفس اور باطن کی اصلاح کی بھی پوری کوشش کرتے تھے اور انہیں بروقت یہ خیال رہتا کہ طلباء کا معیار تعلیم ہی بلند نہ ہو ان کا معیار اخلاق بھی بلند ہو اور وہ درسگاہ سے اچھے انسان اور اچھے مسلمان بن کر نکلیں ۔

اسلام میں تعلیم کی اہمیت مسلمہ امر ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مذاہب عالم میں سب سے زیادہ جس مذہب نے علم اور تعلیم کو ضروری جانا وہ مذہب اسلام ہے۔ اسلام تو انسان کی تخلیق سے قبل ہی علم کی تعلیم کو اہمیت دیتا ہے جیسا کہ سورہ رحمن میں ارشاد ہے کہ ۔

الرحمن علم القران ، خلق الانسان علمه البيان

رحمٰن جس نے قرآن کی تعلیم دی اور انسان کو خلق کیا پھر اسے بیان کرنا سکھایا۔

سب سے پہلا انسان یعنی حضرت آدمؑ کو ملائکہ اور فرشتوں کے مقابلہ میں جس چیز نے فضیلت اور شرف بخشا وہ علم ہی تھا اور رب العزت نے جناب آدم کو تعلیم اسماء دی جن کے ذریعہ حضرت آدم نے خلافت ارض کی حکومت اور سند حاصل کی ۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تو تھا ہی ایک علمی اور فکری انقلاب جس نے علم اور تعلیم کو بنیادی ضرورت قرار دیا اور قرآن مجید نے رسولؐ کی بعثت کا مقصد بتاتے ہوئے صاف کہا کہ ۔

هوالذی بعث فی ..... الخ

ترجمہ: وہ اللہ جس نے مکہ والوں میں وہ رسول مبعوث کیا جو

آیات کی تلاوت کرتا ہے۔ تزکیہ نفس فرماتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب یا تمدن (Culture) ایسا نہیں ہے جس نے تمام انسانوں کی تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا ہو۔ یونان اور چین نے غیر معمولی ترقی کی لیکن وہ بھی تمام انسانوں کی تعلیم کے قائل نہیں تھے بلکہ اھل علم کے ایک طبقہ ہی پر قانع ہوگئے تھے۔

افلاطون یونان کا عظیم فلسفی ہے جس نے جمہوریہ کا تصور اور نظریہ پیش کیا ہے اس میں اس نے بھی جو اونچے سے اونچا خواب دیکھا اس میں بھی فلاسفہ اور اھل نظر کیلئے ایک مخصوص طبقہ کیلئے ہی علم کو ضروری جانا ہے اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے تمام انسانوں پر تعلیم کو فرض قرار دیا اور اس فرض کی انجام دہی کو معاشرہ کی ایک اہم ذمہ داری قرار دیا۔

جیسا کہ حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے۔

طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم ومسلمه

علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

آنحضرت پر جو سب سے پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم کے مقام اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے اس میں تعلیم وتعلم کی ضرورت اور اہمیت ہی کو واضح نہیں کیا بلکہ ذرائع تعلیم " پڑھنا اور لکھنا " کی طرف بھی واضح اشارات فرمائے ہیں۔

اقرا باسم ربک الذی خلق o خلق الانسان من علق o اقرا وربک الاکرم o الذی علم بالقلم o علم الانسان مالم یعلم۔

ترجمہ:-پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کو خون سے ، پڑھ اور تیرا رب کریم ہے وہ جس نے قلم سے

تعلیم دی ۔ انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی، جن کو وہ نہ جانتا تھا۔

حضور نے ارشاد فرمایا ہے کہ **انما بعثت معلما** "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔

تعلیم کیا ہے؟ علم اور تعلیم کی اسی مسلمہ اہمیت کے پیش نظر ہم دیکھیں کہ تعلیم کی نوعیت اور اس کے اسلامی اصول کیا ہیں ۔ تعلیم صرف تدریس عام کا نام ہی نہیں ہے یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ ایک قوم خود آگہی حاصل کرتی ہے اور یہ عمل اس قوم کے تشکیل دینے والے افراد کے احساس وشعور کو نکھارنے کا ذریعہ ہوتا ہے ۔ تعلیم ایک فرض ، جسمانی اور اخلاقی تربیت ہے اور اس کا مقصد ایسے بلند انسان پیدا کرنا ہے جو اپنے کردار اور سیرت کے اعتبار سے ممتاز مقام رکھتے ہوں اور کسی ریاست کے ذمہ دار شہریوں کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دینے کے اہل ہوں ۔

لغت کے اعتبار سے تعلیم کا مادہ (ع ل م) ہے اس کے معنی ہیں کسی چیز کا ادراک کرنا تعلیم کے معنی بار بار کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں حتی کہ متعلم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہوجائے۔ انگریزی زبان کا لفظ Education لاطینی زبان کے لفظ Edex سے بہ معنی ، نکالنا اور Ducer-duc بہ معنی رہنمائی سے ماخوذ ہے لفظی طور پر اس کے معنی (۱) مختلف ماہرین تعلیم اور دانشوروں نے تعلیم کے مفہوم کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے تعلیم کی مختلف توضیحیں کی ہیں مثلاً جان ملٹن تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے۔

" میرے نزدیک مکمل اور شریفانہ تعلیم وہ ہے جو انسان کو بحالت جنگ اور امن اپنی اجتماعی ونجی زندگی کے فرائض دیانت ومہارت اور عظمت کے ساتھ ادا کرنے کیلئے تیار کرے ۔ "

امریکی فلاسفر جان ڈیوی کے نزدیک تعلیم افراد اور فطرت سے متعلق بنیادی طور پر عقلی اور جذباتی رویوں کے تشکیل پانے کا عمل ہے ڈاکٹر بارک کا خیال ہے کہ تعلیم رہنمائی یا مطالعہ سے علم حاصل کرنے اور عادات اختیار کرنے کا عمل یا فن ہے۔ پس تعلیم وہ مسلسل عمل ہے جس کے ذریعہ نئی نسلوں کی اخلاقی ، ذہنی ، جسمانی نشوونما ہوتی ہے اور وہ اپنے عقائد وتصورات اور تہذیب وثقافت کی اقدار بھی اس سے اخذ کرتے ہیں۔

ماہرین تعلیم اس لفظ تعلیم سے دو مفہوم لیتے ہیں۔

وسیع تر مفہوم میں یہ ان تمام طبعی وحیاتیاتی ، اخلاقی ، سماجی اثرات کا احاطہ کرتا ہے جو فرد اور قوم کے طرز زندگی کی تشکیل کرتے ہیں اور محدود مفہوم میں یہ صرف ان اثرات پر حاوی ہے جو اساتذہ کے ذریعہ اسکول اور کالجز میں اور دوسری درسگاہوں میں مرتب ہوتے ہیں بہرحال تعلیم ایک ہمہ گیر عمل ہے اور شاگرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس کا گہرا اثر ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ایک قوم کی زندگی کا انحصار ہی اسکی تعلیم پر ہے ایک چینی کہاوت اس کی کتنی صحیح عکاسی کرتی ہے۔

" تمہارا منصوبہ اگر سال بھر کیلئے ہے تو فصل کاشت کرو، دس سال کے لئے تو درخت اگاؤ، دائمی تو افراد یعنی شخصیتیں پیدا کرو ۔ اور افراد کی تعمیر صرف تعلیم ہی سے ہو سکتی ہے۔"

ایک غلط فہمی کا ازالہ

تعلیم کسی قوم کی سماجی نظریات اور ثقافت سے گہرے طور پر مربوط ہوتی ہے۔ بنابریں کسی قوم کا نظام تعلیم اپنے مزاج ، مواد اور موضوعات کے اعتبار سے نہ تو نظریاتی رنگ سے خالی ہو سکتا ہے اور نہ اس میں اتنی معروضیت ممکن ہے کہ اسے اقدار کی گرفت سے آزاد قرار دیا جاسکے لیکن موجود دور میں لبرازم اور انفرادیت پسندی کے علم برداروں نے تعلیمی دنیا میں اس غلط فہمی کو بڑے زور وشور سے رائج

کرنے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم تہذیبی اقدار اور معیارات خیروشر کے سلسلہ میں بالکل اسی طرح غیر جانبدار ہو سکتی ہے جس طرح طبعی علومؑ اور غلط تصور کی بنا پر تعلیم کو مذہب اور اخلاقی اقدار سے الگ کر دیا گیا اور یہ کہا جانے لگا کہ طالب علم کو اپنی صلاحیت کے مطابق نشوونما پانے کیلئے پوری آزادی ملنی چاہیئے اور اس کی فکر یا کردار کو کسی مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے لئے کوئی بیرونی دباؤ نہیں ہونا چاہیئے۔

یہ طریقِ تعلیم متحدہ ریاست امریکہ میں بہت مقبول ہوا اور اسے دوسرے یورپی ممالک میں بھی خاصی شہرت حاصل ہوئی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بے عقیدہ تعلیم کے نتائج کسی طور بھی حوصلہ افزاء نہیں۔

بے عقیدہ تعلیم کے نتائج

اگر ہم آزاد اور بے عقیدہ تعلیم کے نتائج کا جائزہ لیں تو چند چیزیں سامنے آتی ہیں ۔

(الف) بے عقیدہ تعلیم طلباء میں اجتماعی تصورات پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اور کوئی قوم ان اجتماعی تصورات کے شعور سے بے بہرہ ہوجائے جو اسے عمل اور قربانی پر ابھارتے ہیں تو تاریخ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑجاتی ہے ایسی اقوام جو کسی اجتماعی نظریہ کے زندہ شعور سے عاری ہوجائیں اور جنہوں نے کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لئے مرنا اور جینا نہ سیکھا ہو وہ تاریخ عالم میں کوئی بڑا کارنامہ تو کیا انجام دینگی اپنے وجود تک کو برقرار نہیں رکھ سکتیں تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ جب کسی قوم نے اپنی منزل کا شعور چھوڑ دیا تو وہ نقش پا کی طرح مٹا دی گئی ۔ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

مرگ فرداز خشکی رود حیات
مرگ قوم از ترک مقصود حیات

(ب) بے عقیدہ تعلیم نئی نسل کے قلب ورواج میں اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس کا تعلق صرف دماغ کے مطالبات سے ہے۔ روح کے مطالبات سے یہ بیگانہ وار گزر جاتی ہے۔ دونوں کی نشو نما دو متضاد سمتوں میں ہوتی ہے جس کا نتیجہ ایک زبردست قومی نقصان کی صورت میں نکلتا ہے فلسفۂ حقیقت یہ ہے کہ علم اس وقت حقیقی دوست اور رہنما کا کام کر سکتا ہے جب اس کا محور دل ہو ورنہ صرف تن پرستی کے چکر میں یہ انسان کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ اقبالؒ نے کہا ہے۔

علم را برتن زنی مارے بود
علم را بردل زنی یارے بود

(ج) تعلیم کے بارے میں اسی رجحان کا نتیجہ لامرکزیت اور علم کی شعبہ جاتی جزو پرستی کی صورت میں نکلا ہے۔ بے عقیدہ تعلیم علم کو ایک ہی محور پر مرتکز کرنے میں ناکام رہی ہے طلباء اپنی زندگی اور اردگرد کی دنیا کو چھوٹی چھوٹی غیر مربوط جزئیات کی شکل میں دیکھتے ہیں وہ علم کی وحدت اور زندگی کی یک رنگی اور مرکزیت کے احساس سے محروم ہی رہ جاتے ہیں۔

(د) اور آخری بات یہ ہے کہ بے عقیدہ تعلیم ایسے افراد پیدا کرتی ہے جو زندگی کے بنیادی، حقیقی، واقعی اور زندہ مسائل پر کوئی عبور نہیں رکھتے۔ عملی زندگی کے بارے میں ان کا علم اس قدر سطحی رہ جاتا ہے کہ اس کی کوئی ٹھوس افادیت باقی نہیں رہ جاتی قومی نقطہ نظر سے بھی یہ تعلیم مفید نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ڈاکٹر فرنیک ایڈویلوٹ نے امریکی تعلیم کے بارے میں کہا ہے۔

"مقاصد کے بجائے تکنیک اور ذرائع سے وابستگی ادب، فلسفہ، تاریخ اور مذہب کے مطالعہ کو حقیقی آزادی سے محروم کر رہی ہے۔"

تعلیم کے اسلامی اصول

(۱) تصور علم : اسلام نے جو تصور علم دیا ہے اس میں سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ علم کا سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے علمِ اشیاء اسی کا دیا ہوا ہے اور انسان کی ہدایت کا علم بھی اسی کی طرف سے ہے ۔ حواس اور عقل وتجربہ بڑے اہم ذرائع علم ہیں لیکن وحی سب سے اعلیٰ ذریعہ علم ہے۔ نیز یہ کہ علم کا تعلق محض لوازمات حیات ہی سے نہیں ہے مقاصد حیات سے بھی ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے تابع ہونا چاہیئے یہی وہ تصور ہے جس سے ہمارے پورے نظام تعلیم کا مزاج بنتا ہے۔

اسلام نے جو علم کا تصور دیا ہے اس میں علم اور تربیت دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے اور ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ نفس دونوں کو ساتھ ساتھ انجام دینا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے مخصوص نظام تعلیم اور سیرت سازی ایک ہی حیثیت کے دو پہلو رہے ہیں اور اسکا اظہار علم وفضل کی اصطلاح سے بھی ہوتا ہے جو علم اور نیکی اور اخلاق حسنہ میں بڑھے ہوئے ہونے کے مفہوم کو ادا کرتی ہے۔

(۲) مقصد تعلیم : تعلیم بجائے خود منزل نہیں بلکہ منزل کے حصول کے لئے ایک ذریعہ ہے حقیقی منزل ان لوگوں کا نظریہ حیات اور تمدن وثقافت ہے جن کی خدمت اسے کرنی ہے ۔ این وائٹ ھیڈ نے یہ کہکر اس نکتہ پر بہت زور دیا ہے کہ " تعلیم کی روح یہ ہے کہ وہ مذہبی ہو " علامہ اقبالؒ کا خیال بھی یہی تھا کہ اسلام ہماری زندگی اور تعلیم کا مقصد ہونا چاہیئے تھا انہوں نے خواجہ غلام السیدین کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ۔

" علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہو عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے اس علم سے وہ طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ اگر یہ دین کے تحت نہ رہے تو محض شیطینیت ہے مسلمان کیلئے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے بولہب راحیدر کرار کن ۔ اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہوجائے تو نوع انسان کیلئے سراپا رحمت ہے۔"

پس تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ طلباء میں ان کے مذہب اور نظریہ حیات کی تفہیم وآگہی پیدا کرے۔ قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ اہل علم حق اور سچائی کے گواہ ہیں وہ تعلیم جس کا مقصد اہل علم پیدا کرنے ہوں اسے اولین طور پر اسلام کا علم پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

جب قرآن میں ارشاد ہے ۔

شھداللہ انہ لاالہ الا ھو والملئکۃ واولوالعلم

خدا خود شاہد ہے کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اورفرشتے

اور صاحبان علم بھی اس حقیقت کے شاہد ہیں ۔

رسول اکرمؐ نے ارشادفرمایا ۔ لوگوں میں سے درجہ نبوت کے قریب تر تو اہل علم اور اہل جہاد ہیں اہل علم اس وجہ سے کہ انہوں نے لوگوں کو وہ باتیں بتائیں جو رسول لائے تھے اور اہل جہاد اس وجہ سے کہ انہوں نے پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعت پر اپنی تلواروں سے جہاد کیا۔

(۳) انفرادیت اور اجتماعیت میں توازن

اجتماعیت دونوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور ایک دوسرے کے لئے کسی کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں۔

(۴) تکمیل حیات

تعلیم کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ طالب علم کی انفرادیت کے ارتقاء کو کیا اہمیت دی جائے۔ اس مسئلے میں مختلف نظریات ہیں کوئی فرد پر قوم کو ترجیح دیتا ہے اور کوئی قوم پر فرد کو قربان کردیتا ہے اسلام فرد اور اسلام زندگی اور اس کی مسرتوں کو ترک کرنے کا نام نہیں بلکہ وہ ان کی تکمیل کا داعی ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہماری تعلیم کو ہمارے نوجوانوں کی زندگی اور اس کے مطالبات کی تکمیل کے لئے تیار کرنا چاہیئے۔

(۵) علم کی وحدت اور ہم آہنگی

تعلیم کاایک اور اصول یہ ہے کہ طالب علم کو متوازن اور ہم آہنگ تعلیم حاصل ہو اس میں اتنی قابلیت پیدا ہوجانی چاہیئے کہ وہ دنیا کے نشیب وفراز میں زندگی اور کائنات کی وحدت کو دیکھ سکے۔

(٦) تعمیرِ کردار

تعلیم میں اہمیت طالب علم کے کردار کو ہونی چاہیئے، تعلیم جب تک اچھے کردار تعمیر نہیں کرے گی اسکا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا ۔ امام غزالی نے کہا ہے۔ ''تعلیم کا مقصد یہی نہیں ہونا چاہیئے کہ فرد کے علم کی پیاس بجھا دے بلکہ اس کے ساتھ اسے اخلاقی کردار اور اجتماعی زندگی کے اوصاف نکھارنے کا بھی احساس ہو''۔ یہ ہیں اسلام کے تعلیمی بنیادی اصول جن پر طالب علم عمل کرکے اپنی دنیا اور دین دونوں سنوار سکتا ہے۔

مشہور اہل قلم وائرلپ مین نے اس مضطرب دنیا میں تعلیم کی کیفیت کے موضوع پر ایک تقریر میں کہا تھا۔

" اسکول اور کالج دنیا میں ایسے افراد بھیجتے رہے ہیں جو اس معاشرہ کے تخلیقی اصولوں کو نہیں سمجھ پاتے جس میں انہیں رہنا ہے ۔ اپنی ثقافتی

روایت سے محروم نئے تعلیم یافتہ مغربی افراد اپنے ذہن وجذبات میں مغربی تہذیب کے تصورات ، اصول اور بنیادوں کا اور اسکی منطق واستدلال کا کوئی احساس وشعور نہیں رکھتے اگر یہی نہج رہی تو موجودہ تعلیم آخرکار مغربی تہذیب کو تباہ کردیگی اور واقعہ یہ ہے کہ تباہ کر رہی ہے۔"

امریکی تعلیم پر راک فیلر کی رپورٹ بھی اس خامی کی نشاندہی کرتی ہے۔

" طلبا اپنی زندگی کا کوئی مقصد و مفہوم چاہتے ہیں اگر ان کا زمانہ' ان کی ثقافت اور جب ان کے رہنما انہیں کوئی عظیم مفہوم ، مقاصد وتصورات نہ دیں تو پھر وہ اپنے لئے حقیر اور پست مقاصد متعین کرلیتے ہیں "۔

سروالٹر سویرے نے اپنی کتاب " یونیورسٹی میں بحران " میں جو برطانیہ کے تعلیمی حالات پر مشتمل ہے لکھا ہے ۔

" ہم جس الجھن میں گرفتار ہیں وہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں زیادہ تر طلبہ تعلیم سے فارغ ہوجاتے ہیں مگر اس کا کوئی موقعہ نہیں آتا ہے کہ وہ حقیقی اہمیت کے عظیم مسائل پر اپنا ذہن استعمال کریں۔ تعلیمی غیر جانبداری کے زیراثر وہ موجودہ سیاسی اور سماجی ماحول کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں اور سوچ وبچار کی زحمت نہ اٹھانے کے عادی ہوجاتے ہیں اس طرح وہ لادینیت کو بھی تسلیم کرلیتے ہیں اور یہ اسلئے کہ تعلیم کے مختلف اجزاء میں منقسم ہونے کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے انہیں ذمہ دارانہ حیثیت میں مقصد زندگی کو متعین کرنے کا چیلنج ہی نہیں ملتا۔ گویا مساوی تعلیم کے بعد بھی وہ بنیادی طور پر غیر تعلیم یافتہ ہی رہتے ہیں۔"

تعلیم کے پس منظر کے مکمل جائزے کے بعد پروفیسر ھیرالڈ ایچ ٹیٹس لکھتے ہیں ۔

تعلیم نے اپنے آپ کو ماضی کے روحانی ورثہ سے الگ کرلیا ہے۔ مگر اس کا کوئی مناسب متبادل دینے میں ناکام رہی ہے نتیجتاً پڑھے لکھے افراد بھی ایقان وایمان سے زندگی کی اقدار کے صحیح احساس سے اور دنیا کے بارے میں کسی ناقابل شکست ہمہ گیر نقطہ نظر سے عاری ہوتے ہیں ۔"

ان خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب میں بھی بے عقیدہ اور غیر جانبدارنہ تعلیم کا نظریہ دم توڑ رہا ہے اور مغرب کے اکثر ماہرین تعلیم اور علماء عمرانیات یہ محسوس کرنے لگیں ہیں کہ تہذیب وتمدن کی ترقی اور ثقافت کے تحفظ کی راہ میں یہ نظریہ کس قدر نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے۔

---

(۱) معلومات کا جمع کردینا اور مخفی صلاحیتوں کو نکھارنا ہیں ،.بہر طور یہ لفظ معلومات فراہم کرنے اور پوشیدہ قوتوں کو اجاگر کرنے کے مفہوم میں آتا ہے ۔

عدل

ممکنات عالم کا ہر ذرہ نہ صرف اس امر کا شاہد ہے کہ اس کا کوئی خالق اور صانع ہے بلکہ یہ بھی گواہی دے رہا ہے کہ وہ عادل ہے۔ ہر شے کی ترتیب و تنظیم ایک دوسرے کا ربط موزونیت اور مناسبت پکارپکار کر کہہ رہی ہے کہ ہمارا خالق مدبر بھی ہے اور منصف بھی ۔ جمادات کی دنیا ہو یا نباتات کی ، حیوانات ہوں یا انسان ہر چیز برمحل اور باموقع ، زمین جو سب سے زیادہ پست سمجھی جاتی ہے ، ہر مخلوق جس پر رواں دواں ہے جسکے سینہ پر ہل چلا کر اور جگر شگافتہ کرکے کاشت کی جاتی ہے۔ جس کی آغوش میں سمندر متلاطم اور نہروں میں پانی ہی پانی ہے۔ اگر اتنی سخت نہ ہوتی تو کون اسے پامال کرسکتا اور کس طرح شاہراہیں اور فلک بوس عمارتیں تعمیر ہوتیں اور اگر پتھر سے زیادہ سخت ہوتی یا پتھر ہی بن جاتا تو کس کی مجال تھی کہ اس کے سینہ کو چھلنی کرکے طرح طرح کے پھل اور قسم قسم کی مشینیں پھرائی جاتیں یا اگر سمندر کے پانی کی طرح یہ بھی پرشور ہوتی تو کیا سرسبز وادیاں انسان کے قدم چوم سکتی تھیں طرح طرح کی نعمتیں میسر آسکتی تھیں ؟ کیا حسین سبزہ زار نظر افزا اور دلبستگی کے سامان بہم پہونچا سکتے ؟ اس انداز اور اس توازن سے پیدا کیا کہ ذہن متحیر رہ جاتا ہے یا پھر تقریباً تین چوتھائی سمندر ایک بحرناپیدا کنار تاحد نظر پانی ہی پانی ۔ اگر نمکین نہ ہوتا تو تعفن پیدا نہ ہوجاتا ؟ اور اسکا تعفن اس کی عظیم اور لامحدود مخلوق کو زندگی بخش سکتا تھا ؟ کیا لاکھوں قسم کے حشرات اور مخلوق کی یہی نمک اور آب شور غذا نہیں ہے ؟

عدل علم کی طرف عمومی طور سے یہ کی جاتی ہے **وضع الشیی الیٰ محلہ** " کسی شے کو اس کے مقام پر یعنی جس چیز کیلئے جو مقام مناسب

اور جو محل موزوں ہے اسے وہیں رکھا جائے " بنایا جائے اور پیدا کیا جائے۔
والسماء رفقها ووضع الميزان " اللہ نے آسمان کو بلند کیا اور (انصاف) ترازو کو قائم فرمایا " یہ انصاف اور میزان کائنات کی کسی مخصوص شے کیلئے نہیں بلکہ تخلیق عالم کی خوبی اور کمال اور ہر ذرہ اور شے میں اعتدال پایا جاتا ہے اور یہی خالق کا انتظام واہتمام ہے۔

رب الارباب نے دنیا کی ہر شے میں افراط وتفریط سے علیحدہ رہتے ہوئے درمیانی راہ اختیار کی ۔ جسے اعتدال کہتے ہیں ۔ مثلاً انسانی صفات اور کمالات میں ، سخاوت پسندیدہ فعل قرار پایا کیونکہ بخل تفریط اور اسراف افراط ہے۔ عدل عظیم صفت کیوں قرار پائی ؟ ظلم ناپسندیدہ اور حد سے زیادہ تفضل اور مہربانی انسان کی عادتیں خراب کردیتی ہے کمال انسانیت اور بشر کی فضیلت جب یہ ہے کہ راہ اعتدال اور درمیانی روش اختیار کرے تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ خلاق کائنات جو اپنے مظہر کو راہ اعتدال پر چلنے کی ہدایت فرماتا ہے خود عدل اختیار نہ فرمائے گا۔ لیکن یہ عدل عمومی کی بات تھی ۔

اصل میں اصول دین میں عدل سے کیا مراد ہے اور ہم نے یہ صفت خصوصی طور سے اصول میں کیوں شامل کی ہے وہ آج کے مقالہ کا عنوان ہے۔

اصول دین میں عدل سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی واجب اور ضروری کام کو ترک نہیں کرتا اور کسی قبیح اور برے کام کا ارتکاب نہیں فرماتا " یعنی کوئی ضروری امر اور فعل واجب ایسا نہیں جسے اللہ تعالیٰ انجام نہ دے اور کوئی براکام اور غلط حرکت ایسی نہیں جو اس سے سرزد ہوسکے۔ وہ خیر ہی خیر بجالاتا ہے کسی شر سے اسکا تعلق نہیں ہوتا اور یہی عدالت ہے اور یہ عدل اس قدر ضروری اور اہم ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے

توحید لازمی اور ضروری ہے اور ہم بغیر توحید کے خداوند بزرگ وبرتر کو خدا ہی سمجھنے کیلئے تیار نہیں اور خود بھی وہ اپنے لئے شرک کو برداشت نہیں کرتا۔ اسی طرح اس کے افعال کیلئے عدالت کمال ہے جس طرح خلاق عالم کی ذات واجب ہر قسم کے نقصان عیب اور برائی سے پاک منزہ اور دور ہے اور ہر ایک خوبی ، بھلائی اور کمال سے متصف ہے اسی طرح اس کے تمام افعال اور امور بھی ہر طرح کی برائی اور بدی سے دور اور ہر طرح کی اچھائی اور کمال کا آئینہ دار ہیں۔

واجب وقبیح اچھائی اور برائی ہے کیا ؟ قبیح اور برائی سے مراد ایسے امور ہیں جس کے کرنے والے کی مذمت اور برائی کرنا اور اس کے نہ کرنے والے کی مدح اور تعریف کرنا درست ہو ۔ جیسے ظلم ، بخل ، وغیرہ اور واجب سے مراد وہ بھلا کام ہے جس کے کرنے والے کی تعریف کرنا اور نہ کرنے والے کی مذمت کرنا درست ہو جیسے اللہ کا شکر بجالانا اس کی عبادت واطاعت کرنا ۔ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنا۔

اب اس سلسلہ میں ذرا تفصیل کی ضرورت ہوگی بحث علمی ہے ذرا ذہن پر زور بھی دینا پڑیگا اور علمی مباحث پر عقل وفکر کو زیادہ استعمال کرنے کی ضرورت بھی ہوگی ۔ علمی مجلس کسی فرضی تعیش یا جذبات کو ابھار کر ذاتی مدح سرائی کے لیئے منعقد نہیں کی جاتی بلکہ حقیقی مسائل کو صحیح طور پر سمجھنے کیلئے برپا کی جاتی ہے اور اس علم کی ناقدری کے دور میں کچھ تو ایسے افراد ضرور ہونے ہی چاہئیں جو کسی محفل میں بیٹھ کر فکروشعور کی باتیں کرنے پر بھی آمادہ ہوں۔

فعل ، کام دو طرح کا ہوسکتا ہے یا اضطراری ہوگا یا اختیاری یا یوں کہہ لیجئے کہ شعور ہوگا یا غیر شعوری اضطراری ، غیر شعوری افعال زیر بحث

نہیں ہیں۔ اسلیئے کہ اللہ تعالیٰ سے وہ سرزد ہی نہیں ہوسکتے ورنہ اللہ ، اللہ ہی نہ رہے گا مثلاً سوتے میں حرکت کرنا یا حادثاتی طور پر گولی کا چل جانا وغیرہ ۔

اب شعوری اور اختیاری افعال ، ان کی چند قسمیں ہیں مثلاً کسی فعل سے عقل اگر متنفر ہے تو وہ فعل قبیح ہے اور اگر عقل متنفر نہیں ہے تو اسکا کرنا اور نہ کرنا برابر ہے یا اگر برابر ہے تو فعل مباح ہے۔ جیسے باغ میں ٹہلنا۔ تفریح طبع کے لئے کوئی دلچسپ کتاب پڑھنا اور اگر کام کرنے کو ترجیح حاصل ہے تو پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس کا ترک کرنا جائز ہے یا نہیں اگر ترک کرسکتے ہیں تو وہ فعل مستحب اور سنت ہے اور اگر ترک کرنا جائز نہیں ہے تو اسی کو واجب یا فرض بھی کہتے ہیں اور اگر ترک کرنے کو ترجیح حاصل ہے تو بھی دو صورتیں ہوں گی فعل جائز ہے یا ناجائز ، اگر جائز ہے تو مکروہ ہے اور اگر ناجائز ہے تو وہ حرام ہوگا ، اس کو شریعت میں دوسرے انداز سے بیان کیا گیا ہے امربالمعروف یعنی " نیکیاں پھیلانا " اور نہی عن المنکر " برائیوں سے روکنا " امربالمعروف کی تین قسمیں ہیں " واجب " جس کا کرنا ضروری اور لازمی ، جس کے نہ کرنے پر انسان گناہگار ہوتا ہے۔ مثلاً نماز روزہ ۔ مستحب ، سنت ایک ہی چیزیں ہیں جس کے کرنے پر ثواب ملتا ہے ، نہ کرنے پر گناہگار نہیں ہوتا ۔ مثلاً نوافل وغیرہ " مباح " جی چاہے کیجئے یا نہ کیجئے۔ نہ ثواب نہ گناہ ۔ جیسے پارک میں ٹہلنا وغیرہ نہی عن المنکر کی دو قسمیں ہیں " مکروہ " جس کا کرنا جائز ہے نہ کرے تو بہتر ہے " حرام " جس کا کرنا ناجائز اگر کریگا تو گناہگار ہوگا اور سزا پائے گا جیسے شراب پینا ، جوا کھیلنا ، داڑھی منڈوانا وغیرہ ۔یہی احکام خمسہ کہلاتے ہیں۔ مباح ، مستحب ، واحب ، مکروہ اور حرام اور دوسرے انداز سے انہیں کو حسن وقبیح کہا جاتا ہے اور حسن وقبیح کا اطلاق تین معنوں پر ہوتا ہے۔

ا ۔ حسن صفت کمال اور قبح صفت نقص کو کہتے ہیں مثلاً علم حسن ہے اور

جہل قبیح ہے۔

۲۔ حسن شے کا موافق طبیعت ہونا اور قبیح طبیعت کے خلاف ہونا۔ مثلاً لذیز چیزیں حسن اور آلام ومصائب کو قبیح کہا جاتا ہے۔

۳۔ حسن وہ فعل ہے کہ جس کا فاعل دنیا میں مدح اور آخرت میں ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے اور قبیح وہ کام ہے جس کا فاعل دنیا میں قابل مذمت اور آخرت میں عذاب کا مستحق قرار پائے۔

پہلے دو معنی کے اعتبار سے حسن وقبیح کے عقلی ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ مگر تیسرے معنی کی جب باری آتی ہے تو حسن وقبیح کے عقلی ہونے کے متعلق حکماء اسلام میں اختلاف پایاجاتا ہے فرقہ اشاعرہ کا خیال ہے کہ اس لحاظ سے اشیاء کے حسن وقبیح پر عقل دلالت نہیں کرتی۔ بلکہ شرع نے جس شے کو حسن کہدیا وہ حسن ہوگئ اور جس شے کو قبیح قرار دیدیا وہ قبیح ہوگئ لیکن فرقہ معتزلہ اور فرقہ امامیہ کے نزدیک تیسرے معنیٰ کے لحاظ سے بھی اشیاء کا حسن وقبیح عقلی ہے حسن فی نفسہ حسن اور قبیح فی نفسہ قبیح۔ شرع تو صرف یہ بتاتی ہے کہ اچھی چیز واقعی اچھی ہے اور بری چیز واقعی بری ہے۔ گویا عقل کی تائید کرتی ہے۔ فرقہ معتزلہ اور امامیہ حسن وقبیح کے عقلی ہونے کے تیسرے نفی پر دلائل پیش کرتے ہیں مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ علم، صدق انصاف اور خوش خلقی افعال حسنہ میں اور ظلم عدوان چوری وغیرہ بری باتیں یعنی قبیح ہیں۔ اور یہ بات فطرت انسانی میں داخل ہے مثلاً کسی سے کہا جائے کہ چاہے سچ بولو یا جھوٹ دونوں حالتوں میں تم کو انعام دیا جائے گا تو یقیناً اگر صاحب عقل ہے تو وہ ضرور سچ بولے گا چاہے اسے حکم شرع معلوم ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ سچ بولنا عقل کے قریب ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر اشیاء کا حسن وقبیح صرف شرع سے معلوم ہوگااور عقل یہ نہ بتاسکے گی کہ کونسی چیز اچھی اور کونسی چیز بری ہے تو پھر

بغیر شرع کے نہ کوئی شے حسن ہوگی اور نہ قبیح ۔ حالانکہ شریعت کے بغیر اشیاء میں حسن وقبیح موجود ہے مثلاً کسی ہندو سے پوچھا جائے کہ علم اچھی چیز ہے یا بری انصاف کرنا بہتر ہے یا بدتر جب کہ وہ صاحب شرع نہیں ہے تو یقیناً وہ اچھی چیز کو اچھی اور بری کو بری بتاتا ہے ، اس سے ثابت ہوا کہ اشیاء کا حسن وقبح فعلی ہے ۔ تیسری بات یہ ہے کہ اگر اشیاء کا حسن وقبح عقلی نہ ہوگا تو شرعی بھی نہ رہے گا اس لئے کہ شارع کے حکم پر یہ فیصلہ کون کریگا کہ یہ صحیح ہے یا غلط ۔ ہوسکتا ہے کہ شارع نے اچھی بات کو بری اور بری کو اچھی کہا ہو لہذا اشیاء کا حسن وقبح شرعی بھی نہ رہیگا۔

اسی طرح یہ کہنا کہ ہندو فاعل مختار نہیں ، عدالت الہیٰ کے خلاف ہے۔ مثلاً بعض افعال ایسے ہیں جن پر ہم کو قابو حاصل نہیں ہم یکایک کوٹھے سے گر گئے اور بعض افعال پر ہمیں اختیار ہے جیسے کوٹھے سے زینہ کے ذریعہ اترنا ، انسان کونسا فعل اختیار کرے گا ؟ دوسرے اگر ہم مختار نہیں ہیں تو مکلف قرار دینا ظلم ہوگا کیونکہ ہمارا کوئی گناہ ہمارا نہ ہوگا اور اسلئے بھی اگر ہمارے افعال کا فاعل اللہ تعالیٰ ہو تو یہ بات عقلاً قبیح ہوگی کہ کام خود کرے اور سزا ہم کو دے ۔ ابوالحسن اشعری اشاعرہ کے راس رئیس اور ان کے متبعین کے نزدیک تمام افعال کا فاعل خدا، بزرگ ہے خواہ وہ افعال خیر ہوں یا افعال شر۔ بندہ اپنے کسی فعل کا فاعل مختار نہیں ۔ بعض اشاعرہ کا خیال ہے کہ فعل تو خدا کا ہوتا ہے لیکن فعل کی طاعت اور معصیت کا تعلق بندہ سے ہوتا ہے اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بندہ جب کسی کام کا پکا ارادہ کرلیتا ہے تو خدا اس کے ارادہ کو پورا کردیتا ہے۔ لیکن فرقہ معتزلہ زیدیہ اور امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ بندہ کے افعال اور ان افعال کے صفات اور وہ کسب جس کا ذکر اشاعرہ نے کیا ہے بندہ کی قدرت واجتہاد سے واقع ہوتے ہیں۔ بندہ اپنے افعال میں مجبور نہیں ہے۔ بندہ کو کام کے کرنے اور نہ

کرنے دونوں پر اختیار ہے۔ اور یہی مسلک درست اور صحیح کیونکہ نہ اللہ ظالم ہے کہ گناہ ہم سے خود کرائے اور سزا ہمیں دے نہ ہم کسی فریضہ کے مکلف کیونکہ جب ہم خود کوئی کام کر ہی نہیں سکتے تو تکلیف کیوں واجب قرار دیجائے لہذا کوئی برائی کرنے پر بھی سزا کے مستحق نہیں ہو سکتے پھر اگر ہم مجبور ہوتے تو ہمارے سارے افعال یکساں ہوتے مگر ہم کوٹھے سے گر بھی پڑتے ہیں اور زینہ کے ذریعہ اتر بھی آتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ **ومن یعمل سوء بحزبہ** جو شخص برائی کا مرتکب ہوگا اس کو اس کی سزا ملے گی۔ **کل امرء بماکسب رہین** " ہر شخص اپنے اعمال میں گرور کھا ہوا ہے " **یا جزاً بماکنتم تعملون** " یہ تمہارے اعمال کی جزا ہے۔ " پھرفرمایا **لایغیر اللہ مابھم حتیٰ یغیروما بانفسھم** " اللہ اس وقت تک ان کی حالت نہیں بدلتا جب تک یہ لوگ خود اپنی حالت نہیں بدلتے۔ " ان تمام آیات سے صاف ظاہر ہے کہ بندہ کا فعل اس کا فعل ہے وہ اللہ تعالی کا فعل نہیں۔

اس طرح کوئی برا کام کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے محال ہے۔ اسلئے کہ علم قبیح سے روکنے والا اللہ تعالیٰ کا علم موجود ہے اور کوئی ایسی مجبوری اور ضرورت نہیں کہ اللہ سے برا کام کرا رہی ہے اور وہ قادر اور مختار ہے بلکہ " **ان اللہ علی کل شی قدیر** " ہے پھر اچھائی کو ترک کرکے برائی کو کیوں اختیار کریگا اور تیسری بات یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ سے کوئی برا کام سرزد ہوسکتا ہے تو کسی نبی کی نبوت کا ثابت ہونا محال ہوگا کیونکہ جب خدا برا کام انجام دے سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی کاذب جھوٹے گناہگار انسان کے ہاتھ معجزہ ظاہر کرانا شروع کردے یا کسی ایسے نبی کو بھیجدے جو حکم دے کہ اللہ کی بجائے شیطان کی عبادت کرو یا نماز روزہ حرام اور ظلم، سرکشی مکروفریب جائز، لیکن ایسے کسی شخص کا رسول بنا کر بھیجنا درست

نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ سے کسی برے کام کا صادر ہونا بھی ممکن نہیں اسی طرح اگر خدا سے برے کام صادر ہوسکتے ہیں تو پھر یہ ممکن ہے کہ جنت دوزخ موجود ہو اچھے کام پر ثواب اور برے کام پر سزا اور قیامت کے آنے کی خبر غلط ہو لیکن یہ خبریں صحیح ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ سے کوئی فعل قبیح سرزد ہونا ممکن نہیں۔

چوتھی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی یقناً کوئی غرض اور غایت ہوتی ہے وہ حکیم مطلق ہے اور کسی حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا اگر بغیر غرض کے کوئی فعل واقع ہوگا تو باری تعالیٰ کا فعل عبث اور بیکار ہو جائے گا اور پھر وہ حکم نہ رہیگا لیکن اشاعرہ یہاں بھی یہی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے افعال غرض سے خالی ہوتے ہیں کیونکہ اس سے اللہ میں نقص لازم آئیگا خوب ! اللہ میں نقص تو اس وقت لازم آسکتا ہے جب کہ یہ غرض اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو ۔ اور اگر غرض بے فائدہ بندہ کا ہے یا نظام کائنات کو چلانا ہے تو پھر ذات واجب کیا نقص لازم آئے گا اور یہی باتیں قرآن کہتا ہے ۔ مثلاً **وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون** اللہ نے " جن اور انسان کو عبادت کیلئے پیدا کیا " غرض ہے یا نہیں ؟ لیکن اس غرض اور عبادت سے اللہ کو فائدہ نہیں پہونچتا بلکہ خود انسان کی دین اور دنیا سنورتی ہے۔

افحسبتم انما خلقت کم عبثا " کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا ہے " یقیناً فعل حکیم عبث نہیں ہوتا اس کی غرض اور مصلحت ہوتی ہے اور یہی عین عدل ہے۔ اب بات اتنی سی رہ جاتی ہے کہ اللہ ضرور عادل ہے مگر عدل کو اصول دین میں کیوں داخل کیا گیا۔ جب کہ عام مسلمانوں کے اصول دین صرف تین ہیں ۔ توحید ، نبوت اور قیامت مگر ہمارے یہاں عدل اور امامت کا اضافہ ہے۔ اسوقت صرف عدل ، میں

کسی طوالت میں نہیں جانا چاہتا صرف ایک واقعہ ، اللہ تعالیٰ نے جب فرشتوں کو حکم دیا کہ جوں ہی آدم کے جسم میں روح پھونکی جائے سب سجدہ میں گرجانا فرشتے تیار ہوگئے مگر ابلیس نے کہا مجھے تو نے اگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے اور مٹی آگ سے بہتر ہے پھر فاضل مفضول کو کیسے سجدہ کرسکتا ہے اور اس نے سجدہ نہیں کیا تو کیا ایک سجدہ نہ کرنے کی یہ سزا ہوسکتی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے لعنتی بنا دیا جائے ۔ کیا کسی شریعت میں ایک سجدہ پر اتنی ، اس سے تھوڑی کم سزا ہے اگر ایسا ہے تو لاکھوں مسلمان ایک سجدہ نہیں بلکہ ہزاروں سجدے نہیں کرتے مگر وہ مسلمان رہتے ہیں پھر ایک سجدہ نہ کرنے پر اتنی بڑی سزا کیا عدالت ہوسکتی ہے ؟ جب کہ خدا عادل حقیقی ہے بلکہ حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ ایک سجدہ نہ کرنے پر سزا نہیں تھی ، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عدالت کو چیلنج کرنے پر سزا تھی ابلیس کہتا ہے اور دلیل کے ساتھ کہتا ہے کہ میں بہتر اور افضل ہوں اور آدم مجھ سے کمتر یہ تیرا کیسا عدل ہے کہ اعلیٰ اور برتر کو کمتر کے سامنے جھکائے دیتا ہے۔ گویا اس نے رب الارباب کی عدالت سے انکار کیا اور اسے ظالم تصور کیا جو ایک اصل سے انکار تھا اور اصول دین کی کسی ایک اصل سے انکار کفر ہوتا ہے توحید کو نہ مانے تو کافر ، نبوت کا نہ مانے تو کافر ، قیامت کو تسلیم نہ کرے تو کافر ، تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی خدا کے عدل کا انکار کرے اور لعنتی قرار نہ پائے ؟

یہی واقعہ اور قرآن کی عظیم شہادت بھی بتا رہی ہے کہ عدل اصول دین کا ایک جز ہے اور اتنی عظیم اصل کہ جس کے نہ ماننے اور انکار پر وقت معلوم تک ابلیس لعنتی بنادیا گیا۔

جب عدل ہی پر تمام امور کا انجام اور فیصلہ ہے تو پھر اس کا منکر مسلمان کیونکر رہ سکتا ہے۔ شاید یہ خیال کہ شیعوں نے ہی عدل کو اتنی

اہمیت دی ہے ایسا نہیں ہے بلکہ رب الارباب نے جب دین کی ابتداء کی تھی جب ہی بتا دیا تھا کہ عدل اصول دین میں شامل ہے اور دنیا کو سمجھا دیا تھا کہ عدل کا منکر مسلمان رہنا تو بڑی بات ہے ہمیشہ کے لئے لعنتی بن جاتا ہے۔ جب اللہ نے فرشتوں سے کہا جوں ہی آدم کے پیکر میں روح پھونکی جائے فوراً سجدہ میں گرجانا سارے ملائکہ نے سجدہ کیا ابلیس نے سجدہ نہ کیا اور ہمیشہ کیلئے لعنتی بنا دیا گیا کیا مسلمانوں کی کسی فقہ میں یہ سزا ہے کہ ایک سجدہ نہ کرنے میں کافر بنا دیا جائے کیا ابلیس توحید کا منکر تھا؟ نہیں۔ کیا نبوت کا منکر تھا؟ نہیں۔ کیونکہ اس نے خود کہا کہ تیرے مخلص بندوں کو نہ بہکاؤں گا۔ یعنی وہ بندے جو معصوم ہوں گے اور انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔ کیا قیامت کا قائل نہ تھا پھر وقت معلوم تک کی مہلت پر کیوں راضی ہوا۔ تو برادران اسلام کے تینوں اصولوں، توحید، نبوت اور قیامت کا تو وہ قائل تھا اور ایک سجدہ نہ کرنے پر کسی شریعت اور فقہ میں اتنی سخت سزا معین نہیں پھر اس قدر سخت سزا کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس نے عدل الہیٰ سے انکار ہی نہیں بلکہ اسے چیلنج کیا اور دلیل کے ساتھ جب اللہ نے دریافت کیا **مامنعک الاتسجد اذا امرتک** (تو یہ تو بتا) کہ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا جب کہ میں نے تجھے سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا وہ جواب میں کہتا ہے **انا خیرمنه خلقتنی من نار وخلقته من طین** " میں آدم سے افضل ہوں کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو خاک سے اور افضل کو مفضول کے سامنے جھکنا عدالت کے خلاف ہے۔ اسکا جواب سننے کے بعد اللہ کا ارشاد ہوا **فاخرج** " ملعون نکل جا۔ " گویا تو مجھے غیر عادل سمجھتا ہے اور غلط کار جانتا ہے۔ گویا یہ سزا ترک سجدہ پر نہ تھی بلکہ ترک سجدہ کے پردہ میں عدل الہیٰ سے انکار پر تھی کمبخت دھوکا کھا گیا فوراً کہتا پالنے والے یہ میری اجتہادی غلطی ہے معاف فرمادے۔

ا عدل اصول دین میں شامل نہ ہوتا تو ہر ہمیشہ
لئے لعنتی اور مردود نہ بنایا جاتا۔ لہذا یہ کوئی شیعت کی اپج نہیں بلکہ عقل
وفکر کا تقاضہ ہے کہ اپنے دین کو مستحکم بنایا جائے اور ہر طرح اور ہر خطرہ
سے محفوظ بنالیا جائے۔ بیشک عدل الہیٰ پر کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ صرف
دنیا کی اساس ہی عدل نہیں بلکہ دین کی اساس بھی بدرجہ اتم ہے۔ اللہ ہم
سے خود فرماتا ہے کہ **ان اللہ یامر بالعدل والاحسان** " بیشک اللہ
نے عدل اور احسان کا حکم دیا " اور خود عدل نہ کریگا ظالم بن جائیگا اور شر کا
فاعل بن جائیگا ؟

حکومتیں اور اقتدار کفر کے ساتھ رہ سکتی ہیں مگر ظلم کے ساتھ نہیں
اور ہمارے مسلمان بھائی ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ ظالم کی حیثیت سے
برسراقتدار ہے جب کہ وہ خود فرماتا ہے **وان حکمت فاحکم بینھم
بالقسط ان اللہ یحب المقسطین** " اگر ان کے درمیان فیصلہ کرو
تو بیشک عدل وانصاف کے ساتھ یقیناً اللہ عدل وانصاف کرنے والوں کو
دوست رکھتا ہے۔ " اگر وہ عادل نہ ہوگا تو پھر اس آیت کا خود مصداق نہ
ہوجائے گا۔ **اتا مرون الناس بالبر وتنسون انفسکم** " تم لوگوں
کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اپنے آپ کو فراموش کردیتے ہو " رسول اکرم سے
کہلوایا **قل امر ربی بالقسط** " کہدو میرا رب تو عدالت کا حکم دیتا ہے "
اور خود اپنے لئے ارشاد فرماتا ہے **ان اللہ لیس مظلوم للعبید** بیشک
اللہ اپنے بندوں کے حق میں ظلم روا نہیں رکھتا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اصول کافی میں حضرت
ابوبصیر کے ذریعہ روایت کی گئی ہے ۔ مولا نے فرمایا ترجمہ :- جو شخص یہ
گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ برائی کا حکم دیتا ہے تو اس نے خدا پر بہتان باندھا
اور جو شخص یہ گمان کرے کہ خیر کے ساتھ شر بھی اللہ کی طرف سے ہے تو

اس نے بھی اللہ جل جلالہ پر تہمت لگائی ۔

اور ہمیں فخر ہے کہ ہم ان تہمتوں اور بہتانوں سے بہت دور ہیں یاد رکھئے کائنات کے ہر ذرہ ہر گوشہ اطراف واکناف میں عدل الٰہی کی حکمرانی ہے۔ یہ دنیا میں چہل پہل زندگی کی بہاریں اور شباب سب عدل ہی کا ثمرہ ہے اور جس قوم نے عدل کو اپنا لیا وہ زندہ ہو گئی عدل وانصاف سے اقوام میں اس طرح تازگی اور خوشحالی آتی ہے جس طرح بہار کے بادل کسی زمین پر برس کر جوش نمو اور رعنائی بخش جاتے ہیں اسی طرح عدل وانصاف کسی قوم وملت کی دیکھتے ہی دیکھتے کایا پلٹ دیتا ہے۔

عدل حیات اقوام ہے اور ناانصافی موت جہاں عدل وہاں زندگی شباب پر ۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری بھی دنیا بدل جائے تو خالق کو عادل حقیقی مانیں اور بھرپور کوشش کریں کہ ہمارے ہر قول اور فعل میں عدالت ہی عدالت جھلکے۔

وما علینا الا البلاغ۔

مجلس شہادت

پروفیسر مولانا سید عنایت حسین جلالوی اعلیٰ اللہ مقامہ

کی قائم کردہ مجلس عزاء بسلسلۂ شہادت

باب الحوائج حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

انشاء اللہ تعالیٰ تا ظہورِ امامِ زمانہ علیہ السلام

حسبِ دستور ہر سال ۲۴ رجب المرجب بعد نماز مغربین

بوتراب امام بارگاہ عزیز آباد میں منعقد ہو گی

متمنی شرکت:۔ خانوادۂ مولانا جلالوی اعلیٰ اللہ مقامہ

ACC No.....Date.....
Section .....
D.D. Class.....
NAJAFI BOOK LIBRARY

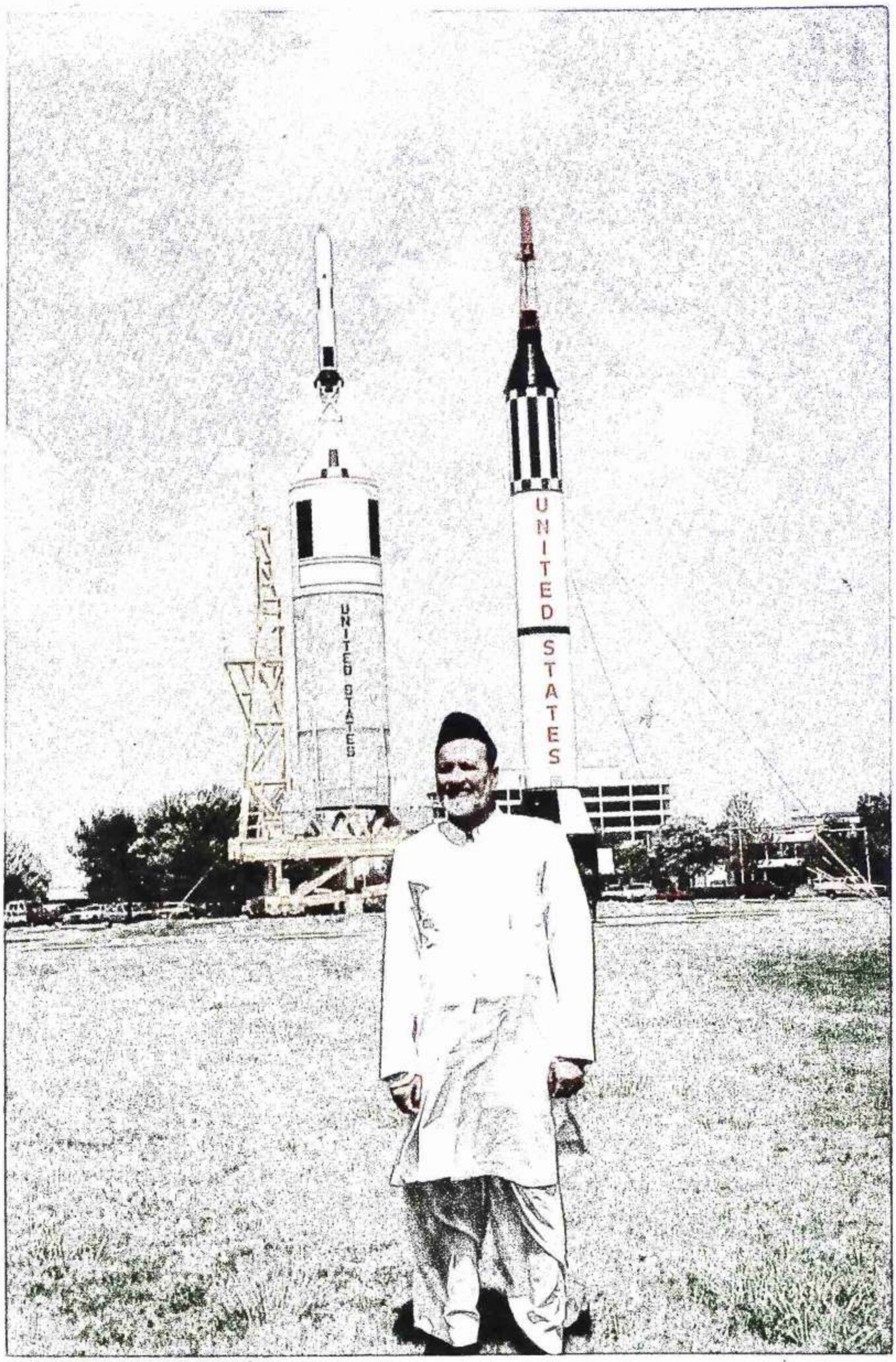

۱۹۸۸ء میں دورۂ امریکہ کی یادگار تصویر